انتخاب وتعارف

شمیم حنفی

HaSnain Sialvi

پریم چند کے منتخب افسانے

(''بڑے گھر کی بیٹی'' سے ''کفن'' تک)

انتخاب و تعارف

شمیم حنفی

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

HaSnain Sialvi

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۵۷

سنِ اشاعت	:	۲۰۰۶ء
قیمت	:	۱۲۰/=
ڈیزائن سرورق	:	محمد ساجد
بہ اہتمام	:	اختر زماں
کمپوزنگ	:	محمد ساجد، عارفہ خانم، جاوید رحمانی
طباعت	:	ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

Prem Chand Ke Muntakhab Afsane

("Bare Ghar Ki Beti" Se "Kafan" Tak)

Edited by : Shamim Hanafi

Price : 120.00

ISBN : 81-7160-131-6

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Urdu Ghar : 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002

Phone : 23236299, 23237210, Fax : 23239547

E-mail : urduadabndli@bol.net.in

HaSnain Sialvi

ترتیب

حرفِ آغاز

یونی ورسٹیوں میں پڑھانے والے پروفیسر زیادہ تر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ پروفیسر جو خود اپنی علمی کارکردگیوں میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ انھیں اپنے فرائضِ منصبی کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی، اور دوسرے گئے گزرے قسم کے وہ پروفیسر ہوتے ہیں جو نہ خود لکھتے پڑھتے ہیں اور نہ ہی طلبہ کو ان سے کوئی فیض پہنچتا ہے۔ معدودے چند پروفیسر ایسے بھی ہیں، جو ایک طرف تو سنجیدہ ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اور دوسری طرف وہ اپنے تدریسی فرائض کو پوری ذمے داری اور لگن سے انجام دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے طلبہ کے لیے رول ماڈل بن جاتے ہیں۔ میں پروفیسر شمیم حنفی کا شمار ایسے ہی پروفیسروں میں کرتا ہوں۔ شمیم صاحب کی وفاداریاں اپنے تدریسی فرائض کے ساتھ اس درجہ ہیں کہ انھوں نے اردو شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے اور شعبے کے ایک عام رکن کی حیثیت سے بھی شعبے کو اونچا اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شعبۂ اردو میری نظر میں ایک لائقِ تقلید شعبہ ہے جس میں بڑا ہاتھ شمیم حنفی صاحب کا ہے۔

شمیم حنفی صاحب ایک انتہائی شائستہ انسان اور ایک دانشور ہیں۔ ان کی شائستگی کے انداز، ان کی گفتگو، عادات واخلاق اور ان کے رہن سہن ہی میں نہیں ان کی ادبی کارکردگیوں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

شمیم صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے ادب سے ہوا۔ انھوں نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں کہانیاں لکھی ہیں اور دوسری زبانوں سے کہانیوں کے ترجمے کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

شمیم حنفی صاحب کی زبان بہت سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ لکھ کر پڑھنے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی وہ انگریزی کی ادبی اصطلاحات کے الٹے سیدھے اردو ترجمے سے اپنی عبارت کو پروقار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (اس طرح کی مستعار اصطلاحوں سے عبارت پروقار تو کیا ہوگی، نا قابلِ فہم ضرور ہو جاتی ہے)۔

شمیم صاحب کا شمار اردو کے ممتاز نقادوں میں ہوتا ہے، اور اس امتیاز کے ساتھ کہ ان پر کسی بھی قسم کے ادبی نظریے کا کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر چہ انھوں نے جدید ادب پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان کا شمار ہمارے جدید ذہن کے ممتاز نمائندہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔

شمیم صاحب نے تنقید میں خود کو کسی ایک مکتبۂ خیال سے وابستہ نہیں رکھا۔ تخلیقی ادب، نظم اور نثر دونوں ہی ان کی دل چسپی کا خاص موضوع ہیں۔ وہ جب کسی متن کو زیر بحث لاتے ہیں تو مصنف اور متن دونوں ایک ساتھ ان کے قلم کی گرفت میں رہتے ہیں۔ ان کی نثر میں بلا کی شگفتگی اور تازہ کاری ہے جسے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل پر بھی لکھتے ہوئے وہ اپنی نثر کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ان کی پہلی کتاب 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' ہے۔ اردو کی جدید شاعری پر جتنی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں شمیم حنفی صاحب کی اس کتاب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جدید غزل پر بھی شمیم صاحب کی ایک کتاب ہے 'غزل کا نیا منظر نامہ'۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے جدید شاعری کے پس منظر میں اردو غزل کا جائزہ لیا ہے۔ ہمارے یہاں جب انتہائی وسیع المطالعہ ادیبوں کا ذکر آتا ہے تو آج کے زمانے میں سب سے سامنے کا نام باقر مہدی کا ہوتا ہے۔ باقر مہدی کے مطالعے میں ادب کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں شامل رہتی ہیں۔ لیکن جب برِ صغیر کے جدید ادب کی بات ہو تو اس پر جن لوگوں کی گہری نظر ہے ان میں ایک نمایاں نام شمیم حنفی کا بھی ہے۔ ادب کے بہت سے ایسے حوالے، جن کے لیے لوگ عام طور پر کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، وہ شمیم حنفی صاحب کی انگلیوں پر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا شمیم حنفی صاحب کا فکشن کا بہت اچھا مطالعہ ہے۔ فکشن کی تنقید پر ان کی گہری نظر ہے۔ جس کا ثبوت اُن کی تنقیدی کتاب 'کہانی کے پانچ رنگ' ہے جس میں انھوں نے کہانی کے اہم فنی پہلوؤں پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔

شمیم حنفی صاحب ایک کامیاب ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ ان کے بہت سے ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'مٹی کا بلاوا'، 'مجھے گھر یاد آتا ہے'، 'زندگی کی طرف' اور 'بازار میں نیند'۔

اردو مترجم کی حیثیت سے بھی ان کا نام بہت ممتاز ہے۔ انھوں نے تقریباً چھ سات کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے ترجموں میں ڈاکٹر تارا چند کی کتاب 'قومی یکجہتی اور سیکولرزم'، مولانا آزاد کی کتاب 'ہماری آزادی'، پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب 'ابتدائی تحریریں: جدوجہد کے سال' شامل ہیں۔ یہ ترجمے اتنے مقبول ہوئے کہ بہت جلد نایاب ہو گئے۔ پروفیسر شمیم حنفی کے تراجم میں کولکتے پر نظموں کا ایک مجموعہ 'شہر خوں آشام' ہے۔ باقی تمام نثری تراجم سیاسی موضوعات سے متعلق ہیں۔

پچھلے چند برسوں سے شمیم صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شائع ہونے والے رسالے 'جامعہ' کے مدیر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ یہ تاریخی جریدہ بھی ان کے ہاتھوں میں آکر سیرت اور صورت دونوں اعتبار سے ایک نئی آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شمیم حنفی ادبی صحافت کے میدان میں بھی اعلیٰ لیاقت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

شمیم صاحب کی کچھ اہم تالیفات بھی ہیں جن میں 'فراق: شاعر اور شخص'، 'دہلی میں اردو خاکہ نگاری'، 'سرسید سے اکبر تک' اور 'سیاہ فام ادب' شامل ہیں۔

عام نقادوں کی طرح شمیم حنفی صاحب کی تنقیدی نظریات مغربی تنقید سے مستعار نہیں ہیں. خود ان کے اپنے مطالعے اور فکر کی گہرائی کا نتیجہ ہیں۔ وہ جیسا پختہ اور رچا ہوا تنقیدی شعور رکھتے ہیں، وہ بہت کم نقادوں کو نصیب ہوتا ہے۔

پریم چند پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پچھلے دنوں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کلیاتِ پریم چند کے نام سے چوبیس جلدوں میں پریم چند کی تمام تخلیقات مرتب کر کے شائع کی ہیں۔ مگر یہ کلیات بھی پریم چند کی چھپی ہوئی عام کتابوں کی طرح متن اور کمپوزنگ کی غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ ہمارے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ یہی غلط متن پڑھاتے ہیں اور طلبہ

یہ غلط متن پڑھنے پر مجبور ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ شمیم حنفی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے پریم چند کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے ایک دفعہ جب شمیم حنفی صاحب سے گفتگو کے دوران پریم چند کی تخلیقات کا ذکر آیا تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اردو ادب کے طلبہ کے لیے کہانیوں کا ایک انتخاب تیار کردیں اور اس انتخاب میں ہر کہانی کا تنقیدی جائزہ بھی شامل کردیں تاکہ یہ انتخاب ہمارے ناقدین، عام قارئین اور طلبہ کے کام آسکے۔

میں شمیم حنفی صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے پریم چند کی بہترین کہانیوں کا ایسا انتخاب مرتب کردیا جس میں پریم چند کی نمائندہ کہانیاں شامل ہیں اور جو طلبہ، اساتذہ اور عام قارئین، سب کے لیے مفید ہے۔

خلیق انجم

خلیق انجم کے نام

پیش لفظ

پریم چند کی منتخب کہانیوں کے اس مجموعے کا خیال ڈاکٹر خلیق انجم کو اور مجھے، لکھنؤ میں منعقدہ ایک علمی اور ادبی تقریب کے دوران آیا۔ پریم چند کے ایک سو پچیسویں یوم پیدائش کے موقعے پر، انھیں اپنی عقیدتوں کا خراج ادا کرنے کے لیے ہندی اور اردو کے بہت سے نامی گرامی ادیب، صحافی، فلم ساز، دانشور اس تقریب میں یکجا ہو گئے تھے۔ پریم چند کی کہانیوں پر مبنی فلمیں دکھائی گئیں۔ مقالے پڑھے گئے۔ تقریریں ہوئیں۔ اور پریم چند کی حسیت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ اس تقریب میں معمر ادیبوں اور دانشوروں سے زیادہ پرجوش حصہ نوجوانوں نے لیا۔ ہماری اجتماعی زندگی کو جو مسئلے اس وقت درپیش ہیں، اُن کے حساب سے دیکھا جائے تو پریم چند آج ہمیں بیشتر نئے لکھنے والوں سے زیادہ بامعنی نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی اردو نظم و نثر کے سیاق میں اقبال اور پریم چند کی صدی کہی جا سکتی ہے۔ دونوں کا سایہ اس پورے دور کی آگہی اور حسیت پر بہت گہرا ہے۔ اقبال اور پریم چند، دونوں کے ذہنی چوکھٹے میں، ہمیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کی زندگی سے وابستہ تصویریں، ایک ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ شاعری تو خیر، نام ہی تخلیقی سرگرمی کی اس جہت کا ہے جو تاریخ کے بطن سے نمودار ہونے کے باوجود، تاریخ کی تابع اور صرف تاریخی سچائیوں میں محصور نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے اقبال کی بصیرت، طرزِ احساس اور تصورات ایک غیر زمانی تناظر اور ایک آفاقی مزاج رکھتے ہیں۔ لیکن پریم چند کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زمان و مکان کے قیود میں رہتے ہوئے بھی، اپنی تخلیقیت کے کھرے پن، اپنے ذہنی اور جذباتی سروکاروں کی بنیاد پر اُس دنیا سے ایک دائمی رشتہ قائم کر لیا جو ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ نت نئی نظریاتی اور فکری تبدیلیوں کے باوجود، اس دنیا کے عذاب اور اندوہ، اس کی بنیادی سرشت اور اس کے رنگ ڈھنگ آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے پریم چند کے عہد میں تھے۔ ہر تہذیب اور ہر معاشرتی اکائی، وقت کے اور تاریخ کے ایک علاحدہ عمل کی پابندی بھی ہوتی ہے۔ یہی علاحدگی باقی ماندہ دنیا سے اس کے فرق اور الگاؤ کا پتہ دیتی ہے۔ اس کی پہچان متعین کرتی ہے۔ بے شک، بیسویں صدی میں وقت کی رفتار بہت تیز رہی۔ مگر ہماری مجموعی نفسیات اور اجتماعی زندگی سے مربوط حقیقتیں، سب کی سب نہ سہی، تاہم، ان کا بیشتر حصہ، جوں کا توں قائم رہا۔ پریم چند نے جن انسانی سروکاروں کو اپنے فن کارانہ شعور کی بنیاد بنایا، ان کی اہمیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اور ہمارا اجتماعی معاشرہ جس انداز سے آگے بڑھ رہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے، یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ پریم چند کے کرداروں کی طرح ان کے زمانے کی

الجھنیں اور مسئلے بھی، ابھی زندہ ہیں، اور ہم اپنے چاروں طرف آج بھی ان کا تماشا دیکھ رہے ہیں، ملال اور اضطراب کی اسی کیفیت کے ساتھ جس طرح پریم چند نے اسے دیکھا ہوگا۔

ان حالات میں، پریم چند کو ایک نئے تناظر کے ساتھ سمجھنے اور ایک نئی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پریم چند نے عملی زندگی کے مصائب، ذاتی پریشانیوں اور الجھنوں میں گھری ہوئی جو زندگی گزاری، اس کا زمانی عرصہ صرف چھپن برسوں کو محیط ہے۔ یہ زندگی قلم کی مزدوری کے ساتھ ساتھ ایک قلمی جہاد میں بھی گزری۔ ہزار آلام اور آزمائشوں کے باوجود، پریم چند اس زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ عجیب بات ہے کہ جیسے جیسے ان کی جسمانی صحت گرتی گئی اور ان کی پریشانیاں بڑھتی گئیں، ان کے انسانی سوز، ان کی امید پروری، ان کے خواب اور خلش، ان کی آرزوئے انقلاب میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ انھوں نے اپنی بعض بہترین کہانیاں اپنی زندگی کے آخری برسوں میں لکھیں۔ اور ان کی تخلیقی زندگی کا نقطۂ عروج، ان کا شاہ کار افسانہ ''کفن'' تو اس وقت وجود میں آیا جب وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرنے والے تھے۔ یہ افسانہ پریم چند نے جامعہ نگر میں اپنے قیام کے دوران، اپنے ایک گاندھیائی دوست پروفیسر محمد عاقل مرحوم کے مکان سے ملحق کنویں کی جگت پر بیٹھ کر لکھا تھا اور اس کی اشاعت دسمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ 'جامعہ' میں ہوئی تھی۔ وہ کنواں اب منہدم ہو چکا ہے!

پریم چند، گاندھی واد کے ساتھ ساتھ، مشترکہ تہذیب، مشترکہ اقدار اور مشترکہ اسلوب زندگی کے سب سے بڑے ترجمانوں میں بھی تھے۔ ان کے خواب سب کے لیے تھے اور ان کا ضمیر اپنے زمانے کی امانت تھا۔ یہاں مذہب، ملت، فرقے، مسلک، زبان کی بنیاد پر من وتو کی کوئی تفریق نہ تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، پریم چند کو اردو زبان کی وسیع المشربی اور رواداری کا سب سے بڑا نقیب سمجھتے تھے۔ اس مونی زبان کے مرکزی مزاج کی نمائندگی میں پریم چند ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اپنی ذہنی اور تخلیقی زندگی کا سفر انھوں نے اردو کے ساتھ شروع کیا تھا، یہ رفاقت تاعمر برقرار رہی۔ اب زبان کے نام پر چاہے جتنے خانے تہہ خانے بنا لیے جائیں، مگر اردو زبان اور پریم چند دونوں نے، ایک دوسرے کو جس طرح مالا مال کیا ہے، یہ روداد ہمیشہ روشن رہے گی۔ یہ روداد، بہ جائے خود، ہمارے دیس اور ہماری اجتماعی زندگی کے لیے ایک سندیسہ بھی ہے۔

اس وقت، جب ساری دنیا میں پریم چند کی یادوں کا جشن منایا جا رہا ہے، ان کے منتخب افسانوں پر مشتمل اس کتاب کی اشاعت اردو اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے اپنی زبان اور روایت کے اس لاثانی معمار کے حضور عقیدت کا ایک نذرانہ بھی ہے۔

شمیم حنفی

نئی دہلی (۱۰ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

مقدمہ

پریم چند کی فکری اور تخلیقی روایت

اردو افسانے نے اپنی عمر کے سو برس پورے کر لیے ہیں۔ پریم چند کے جنم (۱۸۸۰ء) پر ایک سو پچیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو پریم چند اور افسانے کی روایت کا سفر تقریباً ساتھ ساتھ جاری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سائے میں سانس لیتے ہیں اور ایک کے معنی کا تعین دوسرے کے حوالے سے ہوتا ہے۔ پریم چند کی فکری اور تخلیقی روایت کے ساتھ ساتھ، اردو افسانے کی فکری اور تخلیقی روایت کا سلسلہ، بڑی حد تک ایک سی سمت اور رفتار سے جڑا ہوا ہے۔

اب روایت کے سلسلے میں سب سے پہلے جو بات میرے ذہن میں آتی ہے، یہ ہے کہ ہر زندہ روایت کی طرح اردو فکشن کی روایت بھی، اپنے ارتقا کے کسی موڑ پر، کبھی ٹھہری نہیں۔ اس سفر کے دوران سکوت یا انجماد کا لمحہ کبھی نہیں آیا۔ روایت کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ وہ کبھی، کہیں بھی رکتی نہیں۔ رک جائے تو سمجھیے کہ اُس کے انجام یا ہلاکت آفریں اضمحلال کی گھڑی بھی آ گئی اور اب اُس کی توانائی کا ذخیرہ بس ختم ہوا چاہتا ہے۔ اب وہ منزل دور نہیں جب زندگی سے چھلکتی ہوئی یہ روایت تاریخ کے تکیے پر سر رکھ دے گی اور سو جائے گی۔ کسی بھی روایت کا صرف تاریخ میں محصور ہو کر رہ جانا اس کی تکمیل یا تدفین کا اعلان ہے۔

پریم چند کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے تو اپنی آنکھیں تقریباً ستر برس پہلے بند کر لیں، مگر ان کی پرچھائیں ابھی جاگ رہی ہے اور متحرک ہے۔ وہ اپنے اصل روپ رنگ کے ساتھ ہمیں چاہے دھندلے نظر آنے لگے ہوں اور ہماری تخلیقی ترجیحات میں، معیاروں میں، مطالبات میں گزرتے ہوئے زمانے کے ساتھ چاہے جیسا انقلاب آ چکا ہو، پریم چند کی پرچھائیں سے ہمارا مکالمہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ پریم چند کے 'ہوری' نے اردو کے نئے افسانے میں چاہے جتنا بدلا ہوا قالب اختیار کر لیا ہو ('بجوکا'، سریندر پرکاش)، پریم چند ہمارے لیے ابھی تک نہ تو نامانوس ہوئے، نہ صرف تاریخ کا حصہ بن کر ہمارے عہد سے لاتعلق ہو گئے۔ جس طرح ہماری اجتماعی زندگی کے بہت سے عناصر، اس کی پہچان کے بہت سے نشانات مستقل ہیں، اسی طرح پریم چند کی معنویت بھی مستقل ہے۔

پیٹر بروکس نے، ایک حالیہ انٹرویو کے دوران، یہ بات کہی تھی کہ ہمارے عہد میں یہ جو سطیت زدہ یا میڈیوکریٹی کی ماری ہوئی ادبی تخلیقات کی باڑھ سی آئی ہوئی ہے، تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہم عصر لکھنے والوں کی اکثریت اپنی روایت کے امکانات اور اس کی اندرونی طاقت سے کام لینے کا ہنر کھو بیٹھی ہے۔ نت نئے نظریوں اور فارمولوں میں ہمارے ادیب بہت جلد بہہ نکلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت جلد بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ نئی روایت قائم کرنا تو بہت بڑی بات ہے، اپنی رہی سہی روایت کو سنبھالنے کا سلیقہ بھی نیا فکشن لکھنے والوں کی اکثریت کے حصے میں نہیں آیا۔

پریم چند کی تخلیقی اور فکری روایت کے سیاق میں ایک ساتھ دو باتیں عام طور پر کہی گئی ہیں۔ بعد کے لکھنے والوں کا ایک حلقہ تو یہ سمجھتا ہے کہ پریم چند کی جدوجہد آج ایک نیا مفہوم پانے لگی ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ دنیا بے شک آج پہلی جیسی نہیں رہی، لیکن ہمارے گرد و پیش کی زندگی آج بھی اُن مسئلوں کے بوجھ سے رہا نہیں ہو سکی ہے جن کا ادراک پریم چند نے کیا تھا۔ ہماری حسیت کا حوالہ بننے والے ماحول میں ایک ساتھ دو دنیائیں سانس لیتی ہیں۔ ان میں ایک نئی ہے، دوسری پرانی، اور نئے پرانے کی یہ کشمکش ہماری زندگیوں پر آج بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے پریم چند کی فکری اور تخلیقی وراثت کو تاریخ کے ایک نئے شعور کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ دوسری طرف لکھنے والوں کا وہ گروہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ وقت کے ساتھ پرانے تجربوں اور پرانے کرداروں کی دنیا نئے لکھنے والوں کے لیے لائق تقلید نہیں رہ جاتی۔ یہاں میرا اشارہ اس گروہ کی طرف ہے جو ماضی کو اپنے عہد کی حقیقت کے حوالے سے از سرِ نو سمجھنا چاہتا ہے۔ یہ گروہ ماضی کے بوجھ سے یا ہمارے حال میں ماضی کی حقیقت کے وجود سے انکار نہیں کرتا۔ یہ بات بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے وسط میں، فکشن پر برپا ہونے والے ایک سیمینار کے دوران (کلکتے میں) راجندر یادو نے کہی تھی۔ اس لحاظ سے یہ بیان لگ بھگ چالیس برس پرانا ہے۔ مگر پچھلے چالیس پچاس برسوں میں ہماری اجتماعی زندگی نت نئے سوالوں سے دوچار ہونے کے بعد بھی بہت سے پرانے مسئلوں میں الجھی ہوئی ہے۔ عورتوں کے استحصال کا مسئلہ، چھوا چھوت کا مسئلہ، طبقاتی کشمکش اور تصادم کا مسئلہ، گاؤں بنام شہر کے فرق اور فاصلے کا مسئلہ، فرقہ واریت کا مسئلہ۔ یہ تمام مسئلے برصغیر کی اجتماعی زندگی، یا اردو دنیا کی جیتی جاگتی صورتِ حال میں پیوست ہیں۔ اور پریم چند کے بعد کی نسل کے لکھنے والوں نے اپنے اپنے طور پر ان مسائل کی تخلیقی تعبیر سے برابر سروکار رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ پریم چند نے حقیقت کو اسی حد تک سمجھنے اور سمجھانے کی جستجو اپنے فکشن کے واسطے سے کی تھی جہاں تک وہ اسے برداشت کر سکتے تھے۔ ایلیٹ نے کہا تھا کہ حقیقت

کو''ہم اتنا ہی دیکھنا چاہتے ہیں جتنی کہ وہ ہماری برداشت کی حد کے اندر ہو۔'' پریم چند کی حقیقت پسندی میں، اُن کے آدرش واد یا گاندھی واد سے ان کے شغف کا جائزہ، اسی حوالے سے لیا جانا چاہیے۔ اس لحاظ سے پریم چند ہمیں اپنی دہشت زدگی اور بے چینی کے باوجود بہت نرم خو اور سنبھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اپنے اظہار و ادراک دونوں کی سطح پر۔ لیکن انھیں پڑھنا آج بھی حقیقت کی ایک سطح پر اپنے باطن میں سفر کرنا ہے۔ اپنی اجتماعی زندگی سے ہمارا رابطہ اور مکالمہ پریم چند کے واسطے سے، اسی لیے، آج بھی قائم اور مستحکم ہے۔ ایک نئے افسانہ نگار جنھوں نے کہانی لکھنے کی کوشش میں ایک عمر گزار دی، اور جو زندہ کہانی لکھنے کے تجربے سے تا حال نہیں گزرے، ان کے اس بیان کو سن کر میں کانپ اٹھا تھا کہ ''نئے لکھنے والوں کو منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' والے چٹکلوں سے کوئی دل چسپی نہیں۔ گویا کہ اُن عزیز کو زندہ تخلیقی اظہار سے تو خیر دور کی نسبت بھی نہ تھی، حقیقی زندگی کے آشوب اور جیتی جاگتی حقیقتوں سے بھی اُن کا واسطہ نہیں، اور وہ اس ''ماضی'' تک کو مسترد کرنے کے زعم میں مبتلا ہیں جو ہمارے ''حال'' کی پہچان بنا ہوا ہے اور جس کے بغیر ہم اپنی انسانیت تک کا تصور نہیں کر سکتے۔ پریم چند بھی، منٹو کی طرح، ہماری اجتماعی یادداشت کا ایک اٹوٹ حصہ، ہمارا ''ماضی'' ہی نہیں ہیں، ہمارا ''حال'' بھی ہیں، اور ایسا اس حقیقت کے باوجود کہ پریم چند کے ادراک کی کچھ اپنی معذوریاں بھی تھیں اور ان کی بصیرت، اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود، ہمارے لیے رول ماڈل کی حیثیت نہیں رکھتی۔ امرت رائے کی کتاب ''قلم کا سپاہی'' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے، نامور سنگھ نے کہا تھا کہ ''پریم چند کا گاؤں سے اور کسانوں سے کوئی زندہ تعلق نہیں تھا۔'' یعنی یہ کہ پریم چند نے اپنے تخلیقی شعور اور اپنی فکری ترجیحات کا تعین کرنے والے انسانی تجربوں کو سمجھنے اور دیکھنے کے عمل میں، ان تجربوں سے ایک فنکارانہ فاصلہ بھی قائم رکھا۔ لیکن کسانوں، مزدوروں، سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں، محروم و مجبور اور مسلسل زیادتی اور ظلم کا شکار ہونے والے لوگوں کی دنیا پریم چند کے لیے، بہر حال، اجنبی اور نامانوس نہیں تھی۔ 'منٹو' کی طرح، پریم چند نے بھی، حقیر ترین انسانوں کے مقابلے میں بھی اپنے تخلیقی شعور کو اور اپنی بصیرت کو ہمیشہ کم تر جانا۔ ہمدردی، ترحم آمیزی اور اپنے فکشن کا موضوع بننے والی انسانی صورتِ حال میں تبدیلی کی خواہش کے باوجود، ہر طرح کے انقلابی دعوے یا اعلانیے سے پریم چند محفوظ جو رہے تو اسی لیے کہ وہ اپنے کرداروں کا احترام کرتے تھے۔ اپنی انسانیت کو بچائے رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے تجربوں کو وقیع سمجھتے تھے۔ ان پر ترس کھانے یا اپنے احساسات پر اترانے کی علت سے آزاد تھے۔ پریم چند نے ایک شائستہ اور رچی ہوئی فنکارانہ دیانت داری کے ساتھ، وہ کچھ لکھنا چاہا، جو فطرت ان کے باطن کی تختی پر پہلے ہی نقش کر چکی تھی۔ اسی لیے، پریم چند اپنی تحریر میں ہمیں ناگزیر طور پر دیانت دار اور سچے دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند کی طاقت سب سے زیادہ ان کے

سروکاروں میں ہے۔ اسی لیے، میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہماری اجتماعی زندگی کا بنیادی منظرنامہ اور ماحول نہیں بدلتا، ہمارے شعور کے محور اور پریم چند کے سروکاروں کی معنویت میں بھی فرق نہیں آئے گا۔ انھوں نے اپنی چھپن برسوں کی، آلام اور آزمائشوں سے بھری زندگی میں، ایک ذمہ دار ادیب کی حیثیت سے، اس محور کو تبدیل کرنے کی تخلیقی جدوجہد جاری رکھی۔ زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی، کبھی مایوس نہیں ہوئے، کبھی اپنے خوابوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اسی لیے، پریم چند کی جدوجہد آج ایک نیا مفہوم پانے لگی ہے۔ ہماری تخلیقی حسیت پریم چند کی ادبی وراثت سے دست کش ہو بھی جائے، تب بھی، اُن کی جدوجہد اور ان کے سروکاروں کی اہمیت برقرار رہے گی۔ اُن سے منہ پھیر کر ہمارے ادیب نہ تو اپنی انسانیت کو بچا پائیں گے، نہ اپنی تخلیقیت کو۔

اپنے سہج سبھاؤ، اپنی سادگی اور اپنے غم آلود ادراک کے باوجود، پریم چند ہمارے شعور کی سطح میں ہلچل پیدا کرنے، ہمیں اکسانے اور اشتعال دلانے، ہماری بصیرتوں کو تیز کرنے، ہمارے درد اور اجتماعی ملال کو بامعنی بنانے کی ایک انوکھی طاقت رکھتے تھے۔ ان کی حسیت ہمیشہ زمین سے لگ کر چلتی تھی۔ ان کا تخیل اپنی ارضی اور مادّی بنیادوں سے کبھی بے تعلق نہیں ہوا۔ یہ ایک گہرا، گھنا، حقیقت پسندانہ Engagement ہے، اس دیس کی دھرتی اور اس دھرتی پر بسنے والوں سے پریم چند کی وابستگی یا ان کے جذباتی، ذہنی، حسّی کمٹ منٹ (Commitment) میں جو مقامی رنگ ملتے ہیں، وہ جس Native Vigour -- دیسی توانائی کے ساتھ اپنی زندگی کے دکھ اور زمانے کے دکھ کا سامنا کرتے ہیں، اس کی کوئی مثال ہمیں پریم چند سے پہلے کے اردو فکشن میں نہیں ملتی، اتنے کھرے پن، سچائی اور سادگی کے ساتھ اُن کے بعد کے فکشن میں بھی نہیں ملتی۔ وہ غیر دل چسپ ہو جانے یا معنی کے اکہرے پن کا بوجھ اُٹھانے سے کبھی گھبراتے نہیں۔ میں اس حقیقت کے اسباب پر غور کرتا ہوں تو اس نتیجے تک پہنچتا ہوں کہ لکھنا پریم چند کے لیے سانس لینے جیسا تھا۔ ان کے تخلیقی تجربے کی شروعات زمین سے ہوتی ہے۔ اس کا خاتمہ بھی زمین ہی کی سطح پر ہوتا ہے۔
سماجی انصاف (Social Justice) کا مسئلہ پریم چند کے فکری سروکار کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ بہ حیثیت ادیب پریم چند نے ہمیشہ اپنے تجربوں کے بیان سے سروکار رکھا، کبھی ہماری اجتماعی زندگی کے لینڈ اسکیپ میں، چاہے جتنے الجھاوے ہوں، اور ہماری اقتصادی، تہذیبی، سماجی، سیاسی اور قومی زندگی میں چاہے جتنے پیچ ہوں، پریم چند کی کہانی کبھی پیچیدہ نہیں ہوتی۔ کبھی ترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں کرتی۔ قاری کے فہم و ادراک کا کبھی امتحان نہیں لیتی، سپاٹ اور سہل البیان ہونے سے کبھی نہیں ڈرتی۔ پریم چند انسان اور انسان کے رشتے، فرد اور سماج کے رشتے، انسان اور فطرت کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش میں، بہت دور تک جاتے ہیں، سماجی اسٹرکچر کے بہت سے بھیدوں کی

چھان بین کرتے ہیں، اپنے کرداروں کے انفرادی ردعمل کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہیں، بالعموم واقعات اور تجربوں کی اکہری سطح پر، لیکن زندگی کی مانوس سچائیوں کا، ایک گہری، رچی ہوئی انسان دوستی کا سرا، پریم چند کے ہاتھ سے کبھی چھوٹتا نہیں۔ وہ سامنے کی چیزوں اور جذبوں اور احساسات کے حوالے سے اپنی بات کہتے ہیں۔ ان کا ڈھیلا ڈھالا، کہیں کہیں اکتا دینے والا اور بے رنگی کی حد تک سادہ اور پھیکا اسلوب، ہمیں ایک ایسے ذمے دار، دانش مند اور حساس، کھرے اور سچے قصہ گو تک لے جاتا ہے، جس نے اپنے عہد کی زندگی کو کہانی کا قائم مقام بنانے کی جستجو کی۔ پریم چند ایک سادھک کی طرح اپنی دنیا اور اپنی ہستی کا بوجھ اٹھائے، اپنی تخلیقی مشقت میں مگن رہے۔ اسی لیے، اپنے جانے پہچانے منظر نامے کے ساتھ بھی، پریم چند کی بصیرت صرف اپنی تاریخ اور اپنی زمینی یا زمانی صداقتوں کی پابند نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح ہم بالزاک اور فلابیئر کو صرف فرانسیسی سمجھ کر، ٹالسٹائے کو صرف روسی سمجھ کر نہیں پڑھتے، اسی طرح پریم چند بھی اپنی اتھاہ ہندوستانیت کے باوجود، صرف ہندوستانی نہیں رہ جاتے۔

یہاں ہمیں ایک اور حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ واقعات یا سماجی صورت حال کی عمر سے، کسی لکھنے والے کی بصیرت اور معنویت Relevance کو نہیں ناپا جا سکتا۔ ادب کو تاریخ یا سماجیات کی سطح پر رکھ کر سمجھنا ادب، تاریخ اور سماجیات، سب کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ کہانی چاہے جتنے روایتی سانچے کے ساتھ سامنے آئے، ضروری نہیں کہ خود بھی روایتی ہو۔ ہمارے دیس کی علاقائی زبانوں میں، کچھ لوگوں نے پریم چند کے بیانیہ اسلوب سے بھی زیادہ پرانے اسلوب میں ''نئی کہانی'' لکھی ہے۔ نئے اور پرانے کا، یا نئی معنویت اور روایتی معنویت کا فیصلہ، دراصل لکھنے والے کی مجموعی حسیت کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔ فنی حکمت عملی کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔ اس رمز کو سمجھنے کی، ایک بہت سامنے کی مثال پریم چند کی کہانی 'نجات' اور اسی کہانی کی بنیاد پر بنائی جانے والی ستیہ جیت رے کی فلم سدگتی (सदगति) ہے۔ فنی برتاؤ کے مضمرات میں بس ذرا ذرا سے فرق نے کہانی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس برتاؤ (Treatment) یا فنی ادراک، یا حسیت کی بنیاد صرف واقعات یا صرف سماجی حقیقتیں نہیں ہوتیں۔ صرف زبان یا اظہار کے سادھن بھی نہیں ہوتے۔ کہانی کی ساخت یا اس کا اسٹرکچر بھی نہیں ہوتا۔ اس حسیت کی اساس ایک طرح کی ہمہ گیریت، ایک کلیت (Totality) پر استوار اور قائم ہوتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ لکھنے والے کی بصیرت اور اس کی معاشرتی حقیقت میں تال میل ہو، مناسبت اور توازن ہو، اور دونوں کا احاطہ ایک ساتھ کیا جا سکے۔ پریم چند نے کہا تھا: (۱۹۳۶ء)

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو۔ تعمیر کی

روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔۔۔ سلائے نہیں، کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

بدقسمتی سے ہماری اجتماعی زندگی میں ایک حلقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اجتماعی بیداری سے، ایک مثبت اور صحت مند سماجی بے چینی سے ڈرتے ہیں۔ اس لیے، وہ پریم چند سے بھی ڈرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو مرلی منوہر جوشی صاحب یا ان کے حاشیہ نشینوں سے پوچھ لیجیے۔ سابقہ حکومت (NDA) کے دوران پریم چند کی جگہ اسکول کے نصاب میں بی جے پی کی ایک معمولی کارکن کی کتاب کو مروّج کرنے کی کوشش کا مقصد کیا تھا؟

پریم چند کے احساسات اور اُن کی سِدھی ہوئی، سہل اور سادہ زبان کے پیچھے، صدیوں کی تاریخ ہے۔ وہ تاریخ جس کی ترجمانی میر امّن اور غالب اور اشرف صبوحی اور خواجہ حسن نظامی کرتے ہیں۔ دنیا کی دو بڑی تہذیبوں کا ورثہ ہے۔۔۔ انڈو مسلم ثقافت کا ورثہ۔

اس ورثے کا سب سے قیمتی نشان اردو زبان ہے اور اس زبان کا بھی وہ روپ جسے پریم چند نے اپنایا اور ترقی دی۔ محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ ہماری اجتماعی تاریخ اور مشترکہ روایت کے سیاق میں اردو زبان تاج محل سے بھی زیادہ بڑا اور قیمتی تہذیبی تجربہ ہے۔ بہ قول ہربرٹ اسپنسر اس سے پہلے کہ ہم معاشرے کی تشکیل کا بیڑا اٹھائیں، ضروری ہے کہ معاشرہ ہماری تشکیل کر چکا ہو۔ پریم چند اس مرحلے سے گزر چکے تھے۔ اسی لیے، ان کی زبان، ان کا اسلوب، ان کا تخلیقی رویہ، ان کے تجربے اور سروکار۔۔۔۔ سب کے سب اپنی دنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی، ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ پریم چند اس سچائی کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ جدید کاری اور گلوبلائزیشن کے اس تیز رفتار، پر تشدد، دہشت ناک دور میں اپنی اصلیت کو بچائے رکھنا ضروری ہے۔ سو، اسی اصلیت (Originality) کی حفاظت پر انھوں نے اپنے آپ کو مامور کرلیا تھا۔۔۔ وہ ہمارے لیے ایک Icon بن چکے ہیں۔ اب اس Icon کی مدد سے ہم اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔ یہ پریم چند کی تخلیقی طاقت اور ان کی عنصری سادگی کے ساتھ ساتھ اُن کے گہرے انسانی جذبوں کے جادو، دونوں کا اثر ہے۔ پریم چند کی فکری اور تخلیقی روایت، ان دونوں کی دین ہے۔ پریم چند صرف ایک شخص نہ تھے، خیال کا ایک موسم تھے۔ یہ موسم ابھی گزرا نہیں ہے اور ابھی اس کا سایہ ہمارے سروں پر قائم ہے۔ ایک پرانی رُت کی سرگوشی ہم آج بھی سن رہے ہیں۔ شاید اُس وقت تک سنتے رہیں گے جب تک کہ ہماری اجتماعی زندگی کا نقشہ تبدیل نہیں ہو جاتا۔ بہ قول احمد مشتاق:

موسموں کا کوئی محرم ہو تو اس سے پوچھوں　　کتنے پت جھڑ ابھی باقی ہیں بہار آنے میں

بڑے گھر کی بیٹی

بنی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبر دار تھے۔ ان کے بزرگ کسی زمانہ میں بڑے صاحبِ ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں اس دروازہ پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کی موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی، جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لیے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بنی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائداد وکیلوں کو نذر کی اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام شری کنٹھ سنگھ تھا۔ اس نے ایک مدت دراز کی جانکاہی کے بعد بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہاری سنگھ دہرے بدن کا سجیلا جوان تھا۔ بھرا ہوا چہرہ، چوڑا سینہ، بھینس کا دو سیر تازہ دودھ ناشتہ کر جاتا تھا۔ سری کنٹھ اس کے بالکل ضد تھے۔ ان ظاہری خوبیوں کو انھوں نے دو انگریزی حروف بی اے پر قربان کر دیا تھا۔ انہی دو حرفوں نے ان کے سینہ کی کشادگی، قد کی بلندی، چہرہ کی چمک سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقتِ فرصت طِب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دوائیوں پر زیادہ عقیدہ تھا۔ شام سویرے ان کے کمرے سے اکثر کھرل کی خوش گوار پیہم صدائیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

شری کنٹھ باوجود اس انگریزی ڈگری کے انگریزی معاشرت کے بہت مداح نہ تھے۔ اس کے برعکس وہ اکثر بڑے شد و مد سے اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دسہرہ کے دنوں میں وہ بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے۔ اور خود کوئی نہ کوئی روپ روز دھرتے۔ انھیں کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا کا وجود ہوا۔ پرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پُر جوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل جُل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے اسے وہ ملک اور قوم کے لیے فال بد خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں انھیں قبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی

تھیں۔ بعض شریف زادیاں تو انھیں اپنا دشمن سمجھتی تھیں۔ خود انھیں کی بیوی ان سے اس مسئلہ پر اکثر زور شور سے بحث کرتی تھی۔ مگر اس وجہ سے نہیں کہ اسے اپنے ساس، سسر، دیور، جیٹھ سے نفرت تھی۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبہ کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کے عوض یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔ عالی شان محل، ایک ہاتھی، تین گھوڑے، پانچ وردی پوش سپاہی، فٹن، بہلیاں، شکاری کتے، باز، بحری، شکرے، جُرے فرش فروش، شیشہ آلات، آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازمات ہیں، وہ ان سب سے بہرہ ور تھے۔ بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخ دل، حوصلہ مند آدمی تھا۔ مگر قسمت کی خوبی۔ لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں اور ساتوں زندہ رہیں اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو انھوں نے تین شادیاں دل کھول کر کیں۔ مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہو گئے تو آنکھیں کھلیں۔ ہاتھ سمیٹ لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی۔ مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اسے بہت پیار کرتے تھے۔ حسین بچے کو شاید اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ اس کی شادی کہاں کریں۔ نہ تو یہ چاہتے تھے کہ قرض کا بوجھ بڑھے۔ اور نہ یہی منظور تھا کہ اسے اپنے تئیں بدقسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ سنگھ ان کے پاس کسی چندہ کے لیے روپیہ مانگنے کے لیے آئے۔ شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا۔ بھوپ سنگھ ان کے طور و طریق دیکھ کر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے اور شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر میں آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھیں، ان کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا تو کیا ذکر کوئی خوب صورت بجی ہوئی بہلی بھی نہ تھی، ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھی۔ اسے صندوق سے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ غریب شام سویرے اپنے باغیچے میں سیر کرنے کی عادی تھی۔ مگر یہاں باغ کہاں! مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ نہ زمین پر فرش نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادا دہقانی مکان تھا۔ مگر آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنا لیا گویا اس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغیاں لیے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا جلدی سے گوشت پکا دو، مجھے بھوک لگی ہے۔ آنندی کھانا پکا کر ان کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی۔ مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی۔ کفایت شعاری کا سبق ابھی اچھی طرح نہ پڑھی تھی اس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔ لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے ''دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟''

آنندی نے کہا۔ ''گھی سب گوشت میں پڑ گیا۔''

لال بہاری۔ ''ابھی پرسوں گھی آیا ہے۔ اتنی جلدی اٹھ گیا۔''

آنندی۔ ''آج تو کُل پاؤ بھر تھا۔ وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔''

جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے اسی طرح بھوک سے باولا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہو کر بولا۔ میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو۔

عورت گالیاں سہتی ہے۔ مار سہتی ہے مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی منہ پھیر کر بولی۔ ''ہاتھی مرا بھی تو لاکھ کا۔ وہاں اتنا گھی روز نائی کہار کھا جاتے ہیں۔''

لال بہاری جل گیا۔ تھالی اٹھا کر پٹک دی اور بولا۔ ''جی چاہتا ہے تالو سے زبان کھینچ لے۔''

آنندی کو بھی غصہ آیا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی ''وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے۔''

اب نوجوان اجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی جب جی چاہتا تھا اس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اُٹھا آنندی کی طرف زور سے پھینکا۔ اور بولا۔ ''جس کے گمان پر پھولی ہوئی ہو اُسے بھی دیکھوں گا اور تمھیں بھی۔''

آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکا۔ سر بچ گیا۔ مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصہ کے مارے، ہوا سے ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرہ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزت شوہر کی ذات ہے۔ اُسے شوہر ہی کی طاقت اور ہمت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

سری کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ان کی راہ دیکھتی رہی آخر شنبہ کو حسبِ معمول شام کے وقت وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں، کچھ نئے مقدمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے اور سلسلۂ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ یہ دو تین گھنٹہ آنندی نے بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے۔ بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اٹھی۔ جب تخلیہ ہوا تو لال بہاری نے کہا ''بھیا آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجیے گا کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں۔ ورنہ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا۔''

بنی مادھو سنگھ نے شہادت دی۔ ''بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں کہ مردوں کے منہ لگیں۔''

لال بہاری۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں تو ہم لوگ بھی کوئی کرمی کہار نہیں ہیں۔

سری کنٹھ۔ ''آخر بات کیا ہوئی؟''

لال بہاری۔ '' کچھ نہیں یونہی آپ ہی آپ الجھ پڑیں۔ میکہ کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔''

سری کنٹھ کھا پی کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھری بیٹھی تھیں۔ اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے۔

آنندی نے پوچھا۔ ''مزاج تو اچھا ہے۔''

سری کنٹھ بولے۔ ''ہاں بہت اچھا ہے۔ یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے۔''

آنندی کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ اور جھنجلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آ گیا۔ بولی۔ ''جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اُسے پاؤں تو منہ جھلس دوں۔''

سری کنٹھ۔ ''اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو۔ کچھ بات تو کہو۔''

آنندی۔ '' کیا کہوں! قسمت کی خوبی ہے۔ ورنہ ایک گنوار لونڈا جسے چپراسی گری کرنے کی بھی تمیز نہیں مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں اکڑتا نہ پھرتا۔ بوٹیاں نوچ لیتی۔ اُس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے؟''

سری کنٹھ۔۔ ''آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں۔''

آنندی۔ ''پرسوں تمھارے لاڈلے بھائی نے مجھ سے گوشت پکانے کو کہا۔ گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا۔ جب کھانے بیٹھا تو کہنے لگا دال میں گھی کیوں نہیں۔ بس اسی پر میرے میکہ کو برا بھلا کہنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ بولی کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک مارا اگر میں ہاتھ سے نہ روک لوں تو سر پھٹ جائے۔ اُس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ؟''

سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ بولے۔ ''یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا۔''

آنندی رونے لگی جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے، کیوں کہ آنسو ان کے پلکوں پر رہتا ہے۔ عورت کے آنسو مرد کے غصہ پر روغن کا کام کرتے ہیں۔ سری کنٹھ کے مزاج میں تحمل بہت تھا۔ انھیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا۔ مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جا کر بولے۔ ''دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔''

اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لیے سری کنٹھ سنگھ نے اپنے کئی ہم جولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جب اُن کا کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا تھا وہ اس کا مضحکہ اڑاتے اور کہتے تم لوگ بیویوں کے غلام ہو۔ انھیں قابو میں رکھنے کے لیے بجائے خود ان کے قابو میں ہو جاتے ہو۔ مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پُر جوش وکیل آج اپنے باپ سے کہہ رہا تھا۔ ''دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔'' ناصح کی زبان اسی وقت تک چلتی ہے جب تک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے۔ آزمائش کے بیچ میں آ کر ضبط اور حلم رخصت ہو جاتے ہیں۔

بنی مادھو سنگھ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور بولے ''کیوں؟''

سری کنٹھ۔ ''اس لیے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیے وہ ان کے سر چڑھتے ہیں۔ میں تو دوسرے کا غلام ٹھہرا۔ گھر پر رہتا نہیں اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ کڑی بات تک مضائقہ نہیں۔ کوئی ایک کے دو کہہ لے یہاں تک میں ضبط کر سکتا ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسے پڑیں۔ اور میں دم نہ ماروں۔''

بنی مادھو سنگھ کچھ جواب نہ دے سکے۔ سری کنٹھ ہمیشہ ان کا ادب کرتے تھے۔ ان کے ایسے تیور

دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہوگیا۔ صرف اتنا بولا۔ ''بیٹا تم عقل مند ہوکر ایسی باتیں کرتے ہو۔ عورتیں اسی طرح گھر تباہ کردیتی ہیں ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں۔''

سری کنٹھ۔ ''اتنا میں جانتا ہوں۔ آپ کی دعا سے ایسا احمق نہیں ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے کئی خاندانوں کو میں نے علاحدگی کی آفتوں سے بچادیا ہے۔ مگر جس عورت کی عزت اور آبرو کا میں ایشور کے دربار میں ذمہ دار ہوں اس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ میں نہیں سہہ سکتا۔ آپ یقین مانیے میں اپنے اوپر بہت جبر کررہا ہوں کہ لال بہاری کی گوشمالی نہیں کرتا۔'' اب بنی مادھوسنگھ بھی گرمائے۔ یہ کفر زیادہ نہ سن سکے۔ بولے۔ ''لال بہاری تمھارا بھائی ہے۔ اُس سے جب کبھی بھول چوک ہو تم اُس کے کان پکڑو۔ مگر............''

سری کنٹھ۔ ''لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔''

بنی مادھو۔ ''عورت کے پیچھے؟''

سری کنٹھ۔ ''جی نہیں۔ اس کی گستاخی اور بے رحمی کے باعث۔''

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ دھیما کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی۔ اسی اثنا میں کئی اور آدمی حقہ تمباکو کرنے کے لیے آبیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادۂ جنگ ہیں، تو ان کا دل بہت خوش ہوا۔ اور طرفین کی شکر ریز باتیں سننے کے لیے ان کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ ایسے حاسد بھی گاؤں میں تھے جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ اپنے باپ سے دبتا ہے۔ اس لیے وہ خطاوار ہے۔ اُس نے اتنا علم حاصل کیا۔ یہ بھی اس کی خطا ہے۔ بنی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ بُری بات ہے۔ وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ ان کی حماقت ہے۔ ان خیالات کے آدمیوں کی آج امیدیں برآئیں۔ کوئی حقہ پینے کے بہانے سے۔ کوئی لگان کی رسید دکھانے کے حیلہ سے آآکر بیٹھ گئے۔ بنی مادھوسنگھ پُرانا آدمی سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات دل میں پھولے نہیں سماتے۔ اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں خوش نہ ہونے دوں گا۔ خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکا یک لہجۂ تقریر نرم کرکے بولے۔ بیٹا میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں تمھارا جو جی چاہے وہ کرو۔ اب تو لڑکے سے خطا ہوگئی۔''

الہ آباد کا نوجوان، جھلایا ہوا گریجویٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈیبیٹنگ کلب میں اس نے اپنی

بات پر اڑنے کی عادت سیکھی تھی۔ مگر عملی مباحثہ کے دوران پیچ سے واقف نہ تھا۔ اس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا وہاں تک اس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا ''میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔''

باپ۔ ''بیٹا تم عقل مند ہو۔ اور عقل مند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے۔ اس سے جو کچھ خطا ہوئی اُسے تم بڑے ہو کر معاف کر دو۔''

بیٹا۔ ''اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ یا تو وہی گھر میں رہے گا۔ یا میں ہی رہوں گا۔ آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجیے۔ میں اپنا بوجھ آپ اُٹھا لوں گا۔ اگر مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہیے جہاں چاہے چلا جائے۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

لال بہاری سنگھ دروازہ کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑا بڑے بھائی کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ اسے کبھی اتنی جرأت نہ ہوئی تھی کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے۔ یا حقہ پی لے۔ یا پان کھالے۔ اپنے باپ کا بھی اتنا پاس ولحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی۔ اپنے ہوش میں انھوں نے کبھی اُسے گھڑکا تک نہ تھا۔ جب الٰہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مُگدر کی جوڑی انھیں نے بنوادی تھی۔ پچھلے سال جب اس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا تو اُنھوں نے خوش ہو کر اکھاڑے ہی میں جا کر اُسے گلے سے لگا لیا تھا۔ اور پانچ روپیہ کے پیسے لٹائے تھے۔ ایسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا۔ اُسے ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی سے اس کا دل ہر دم دھڑکتا تھا۔ کہ دیکھوں بھیا کیا کہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ میں اُن سے کیسے بولوں گا۔ میری آنکھیں اُن کے سامنے کیسے اُٹھیں گی۔ اُس نے سمجھا تھا کہ بھیا مجھے بلا کر سمجھا دیں گے۔ اس امید کے برخلاف آج وہ انھیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا مگر اس کا دل کہتا تھا کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر سری کنٹھ اُسے اکیلے بلا کر دو چار سخت باتیں بلکہ دو چار طمانچے لگا بھی دیتے تو شاید اسے اتنا ملال نہ ہوتا۔ مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں لال بہاری سے نہ سہا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر میں آیا۔ اپنے کوٹھری میں جا کر کپڑے پہنے۔ آنکھیں پونچھیں، جس میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ روتا تھا۔ تب آنندی دیوی کے دروازہ پر آ کر بولا۔ ''بھابی! بھیا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے۔ وہ اب میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لیے میں اب جاتا ہوں۔ انھیں پھر منہ نہ

دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اسے معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہوگئی۔

(۴)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے آنندی کے دروازہ پر کھڑا تھا اُسی وقت سری کنٹھ سنگھ بھی آنکھیں لال کیے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں۔ اور کترا کر نکل گئے۔ گویا اس کے سایہ سے بہت پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی۔ مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعاً نیک عورت تھی۔ اور اس کے خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھنجھلا رہی تھی کہ یہ اس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الٰہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں تو میں کیسے کیا کروں گی، اس کے چہرے کو زرد کیے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں جب اس نے لال بہاری کو دروازہ پر کھڑے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "اب میں جاتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہو معاف کرنا۔" تو اُس کا رہا سہا غصہ بھی پانی ہوگیا۔ وہ رونے لگی۔ دلوں کا میل دھونے کے لیے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا "لالہ باہر کھڑے ہیں۔ بہت رو رہے ہیں۔"

سری کنٹھ۔ "تو میں کیا کروں؟"

آنندی۔ "اندر بُلا لو۔ میری زبان میں آگ لگے۔ میں نے کہاں سے یہ جھگڑا اُٹھایا۔"

سری کنٹھ۔ "میں نہیں بلانے کا۔"

آنندی۔ "پچھتاؤ گے انھیں بہت گلان آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں چل دیں۔"

سری کنٹھ نہ اُٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا۔ "بھابی! بھیا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لیے میں بھی اپنا منہ انھیں نہ دکھاؤں گا۔"

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا۔ اور تیزی سے باہری دروازہ کی طرف جانے لگا۔ یکا یک آنندی اپنے گھر سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا۔ اور آنکھوں

میں آنسو بھر کر بولا۔ ''مجھے جانے دو۔''

آنندی۔ ''کہاں جاتے ہو؟''

لال بہاری۔ ''جہاں کوئی میرا منہ نہ دیکھے۔''

آنندی۔ ''میں نہ جانے دوں گی۔''

لال بہاری۔ ''میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔''

آنندی۔ ''تمھیں میری قسم اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔''

لال بہاری۔ ''جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا کہ بھیا کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا یا نہیں تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔''

آنندی۔ ''میں ایشور سے کہتی ہوں کہ تمھاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔''

اب سری کنٹھ کا دل بھی پگھلا۔ انھوں نے باہر آ کر لال بہاری کو گلے لگا لیا اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ روئے۔ لال بہاری نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''بھیا! اب کبھی مت کہنا کہ تمھارا منہ نہ دیکھوں گا۔ اس کے سوا جو سزا آپ دیں گے وہ میں خوشی سے قبول کروں گا۔''

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ ''للو ان باتوں کو بالکل بھول جاؤ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا۔''

بنی مادھو سنگھ باہر سے آ رہے تھے دونوں بھائیوں کو گلے ملتے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بول اٹھے ''بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں بگڑتا ہوا کام بنا لیتی ہیں۔'' گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سنا۔ ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی۔ ''بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

زمانہ (دسمبر ۱۹۱۰ء) پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی یہ پہلی تصنیف ہے اس سے پہلے ساری تصانیف نواب رائے کے نام سے چھپتی تھیں یہ قصہ پریم پچیسی میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سروور ۷ میں شامل ہے۔

نمک کا داروغہ

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا اور ایک خداداد نعمت سے فائدہ اٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی تو لوگ دروازۂ صدر بند پا کر روزن اور شگاف کی فکر کرنے لگے۔ چاروں طرف خیانت، غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹوار گری کا معزز اور پر منفعت عہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغۂ نمک کی برقندازی کرتے تھے اور اس محکمہ کا داروغہ تو وکیلوں کے لیے بھی رشک کا باعث تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی تعلیم سندِ افتخار تھی۔ لوگ حسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قابل ہو جاتے تھے۔ منشی دھرنے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصۂ غم کو دریافت امریکہ یا جنگ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاندیدہ بزرگ تھے سمجھانے لگے۔ ''بیٹا! گھر کی حالت زرا دیکھ رہے ہو قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں، لڑکیاں ہیں وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی آرہی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں نہ معلوم کب گر پڑوں، تمھیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا خیال نہ کرنا، یہ تو پیر کا مزار ہے، نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیے۔ ایسا کام ڈھونڈ جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو، ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے، بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے اس لیے اس میں برکت نہیں ہوتی، بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اس لیے اس میں برکت ہوتی ہے اور تم خود عالم و فاضل ہو تمھیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے۔ انسان کو دیکھو! اس کی ضرورت کو دیکھو، موقع دیکھو اور خوب غور سے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رخی کر سکتے ہو لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو، میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔''

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا

استقلال، اپنا رفیق، اپنی ہمت، اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے، خوبی قسمت ساتھ تھی، صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہوئے مشاہرہ معقول، بالائی رقم کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سند لی، پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔

(۲)

جاڑے کے دن تھے۔ رات کا وقت۔ نمک کے برقنداز چوکیدار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ منشی بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن اس عرصے میں ان کی فرض شناسی نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گزرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کیے ہوئے میٹھی نیند سوئے تھے یکا یک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شور وغل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں۔ اُٹھ بیٹھے، اتنی رات گئے کیوں گاڑیاں دریا پار جاتی ہیں، اگر کچھ دغا نہیں ہے تو اس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں؟ شبہ کو استدلال نے ترقی دی۔ وردی پہنی، طمانچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھاتے ہوئے دریا کے کنارے آپہنچے۔ دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلفِ محبوب سے بھی زیادہ طولانی پل سے اُتر رہی ہے۔ حاکمانہ انداز سے بولے۔

''کس کی گاڑیاں ہیں؟''

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا، آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا۔
''پنڈت الوپی دین کی۔''

''کون پنڈت الوپی دین؟''

''داتا گنج کے۔''

منشی بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا، لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں۔ غلے کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحبِ اثر، بڑا حکام رس، بڑے بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے۔ بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا کہاں جائیں گی۔ جواب ملا کہ کان پور۔ لیکن اس سوال پر کہ ان میں ہے کیا؟ ایک خاموشی کا عالم طاری ہو گیا اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کے ناکام انتظار کے بعد

ذرا زور سے بولے۔ ''کیا تم سب گونگے ہو گئے۔ ہم پوچھتے ہیں ان میں کیا لدا ہے؟''

(۳)

جب اب بھی کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا۔ یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار سوتے جاگتے چلے آتے تھے کہ کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آکر جگایا اور بولے۔ ''مہاراج دروگا نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں۔''

پنڈت الوپی دین مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے۔ اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے۔ اچھا چلو ہم آتے ہیں۔ یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلفانہ انداز سے بولے۔ ''بابو جی آشیر باد! ہم سے کیا ایسی خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظر عنایت ہی رہنی چاہیے۔''

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا۔ بے اعتنائی سے بولے۔ ''سرکاری حکم۔''

الوپی دین نے ہنس کر کہا۔ ''ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو۔ ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔''

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانتداری کا تازہ جوش تھا۔ کڑک کر بولے۔ ''ہم ان نمک حراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا۔ بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جمعدار بدلو سنگھ! تم انھیں حراست میں لے لو، میں تمھیں حکم دیتا ہوں۔''

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہوا خواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ یہ شاید

زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا لیکن فرطِ رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہ پایا تھا۔ سکتے میں آگئے خیال کیا کہ ابھی طفلِ مکتب ہے دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا، الھڑ ہے، جھجکتا ہے، زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکسرانہ انداز سے بولے۔ ''بابو صاحب ایسا ظلم نہ کیجیے۔ ہم مٹ جائیں گے، عزت خاک میں مل جائے گی۔ آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ بہت ہوا تھوڑا سا انعام و اکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑے ہی ہیں۔''

بنسی دھر نے سخت لہجہ میں کہا۔ ''ہم ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے۔''

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا۔ اعتمادِ نفس اور غرورِ دولت کو صدمہ پہنچا لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے۔ ''لالہ جی ایک ہزار کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو، آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں۔''

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا۔ ''ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستہ سے نہیں ہٹا سکتا۔''

دولت، فرض کی خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجلائی۔ اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکہ کی کش مکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کیے۔ ایک سے پانچ ہزار تک، پانچ ہزار سے دس ہزار تک، دس ہزار سے پندرہ، پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی۔ لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلے میں یکہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے۔ ''اس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔'' بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے اور نہایت منت آمیز بے کسی کے ساتھ بولے۔ ''بابو صاحب ایشور کے لیے مجھ پر رحم کیجیے میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔''

''غیر ممکن۔''

''تیس ہزار۔''

''غیر ممکن۔''

''کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں؟''

''چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ بھی غیر ممکن۔ بدلو سنگھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔''

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لیے ہوئے دیکھا، چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(۴)

دنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہ رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والے حکام سرکار، ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ اور ساہوکار یہ سب پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور وہ کانسٹبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، دل میں غصہ وغم، تو سارے شہر میں ہل چل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوق نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو، کثرتِ ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپیدا کنار کے نہنگ تھے، حکام ان کے قدر شناس عملے، ان کے نیاز مند، وکیل اور مختار ان کے ناز بردار اور اردلی، چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام تھے۔ انھیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے۔ ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لیے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو، کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اس حملے کو روکنے کے لیے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ بنسی دھر کھڑے تھے۔ یکہ و تنہا سچائی کے سوا کچھ پاس نہیں۔ صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں لیکن ترغیبات سے ڈانواڈول۔ حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے کھچا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ انصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ

چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ بہت جلد فیصل ہوگیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے۔ وہ ایک صاحب ثروت رئیس تھے یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لیے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ نہیں تو ایک افسوسناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہیں لیکن صیغۂ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز ادراک کو مغلوب کر دیا ہے، اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہیے۔

وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے، پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے، حوالیوں نے روپے برسائے سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آگیا اور اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے نگاہیں غرور سے لبریز، تو طعن اور تمسخر کے آوازیں چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کیے لیکن اشارہ اس وقت اس نشۂ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا، شاید مقدمے میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اسے پہلا سبق دے دیا تھا۔ انصاف علم اور پنچ حرفی خطابات اور لمبی داڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں۔

(۵)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجبی تھی۔ مشکل سے ایک ہفتہ گذرا ہوگا کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بیچارے دل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بدظن ہو رہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی۔ ہم تو کلوار اور بوچڑ کے تقاضے سہیں، بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ۔ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا اور آپ دیانتدار بنے چلے ہیں۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلائیں گے۔ تف ایسی سمجھ پر، پڑھانا لکھانا سب اکارت گیا۔ اسی اثنا میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے روداد سنی تو سر پیٹ لیا اور بولے۔ ''جی چاہتا ہے اپنا اور تمھارا سر پھوڑ لوں۔'' بہت دیر تک پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے۔ غصے میں کچھ سخت وست بھی کہا اور بنسی دھر وہاں سے ٹل نہ جاتے تو عجب نہ تھا کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا، جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے کئی دن تک سیدھے منہ بات نہیں کی۔

اس طرح اپنے بیگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دل دوز ہمدردیاں سہتے سہتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آ کر رُکا۔ سبز اور گلابی رنگ کے پردے، پچھائیں نسل کے بیل ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے سینگ پیتل سے منڈے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دوڑے۔ دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں، جھک کر سلام کیا اور مدبرانہ درافشانیاں شروع کیں۔ آپ کو کون سا منہ دکھائیں منہ میں کالک لگی ہوئی ہے مگر کیا کریں لڑکا نالائق ہے نا خلف ہے ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے، ایشور بے چراغ رکھے مگر ایسی اولاد نہ دے۔ بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا مصافحہ کیا۔ لیکن شانِ خودداری لیے ہوئے۔ فوراً گمان ہوا یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندۂ معذرت نہیں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت ناگوار گزرا۔ یکا یک پنڈت جی نے قطع کلام کیا۔ ''نہیں بھائی صاحب ایسا نہ فرمائیے۔''

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے فوراً جواب دے دیا۔ اندازِ حیرت سے بولے۔ ''ایسی اولاد کو اور کیا کہوں۔''

الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ ''فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پا کر پرماتما کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی! اسے زمانہ سازی نہ سمجھیے۔ زمانہ سازی کے لیے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لیا تھا آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے، ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا۔ لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے، میں نے سب کو اپنا اور قیمتی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟''

بنسی دھر کو ان باتوں سے کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اُڑتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے۔ ''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، فرض نے مجھے آپ کی بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کی خاکِ پا ہوں جو آپ کا ارشاد ہوگا بحدِ امکان اس کی تعمیل میں عذر نہ کروں گا۔''

الوپی دین کی التجا آمیز نگاہوں نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا لیکن یہ سوال پورا کرنا پڑے گا۔''

بنسی دھر نے جواب دیا۔ ''میں کس قابل ہوں لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی اس

میں دریغ نہ ہوگا۔"

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے۔ "اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمایئے اور اس پر دستخط کیجیے۔ میں برہمن ہوں جب تک یہ سوال پورا نہ کیجیے گا دروازے سے نہ ٹلوں گا۔"

منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انھیں اپنی ساری ملکیت کا مختارِ عام قرار دے دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ، جیب خرچ کے لیے۔ روزانہ خرچ الگ، سواری کے لیے گھوڑے، اختیارات غیر محدود، کانپتی ہوئی آواز سے بولے۔ "پنڈت جی میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے آپ نے بیکراں عنایات کے قابل سمجھا لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔"

الوپی دین بولے۔ "اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجیے۔"

بنسی دھر نے متین آواز سے کہا۔ "یوں میں آپ کا غلام ہوں آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لیے فخر کی بات ہے لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست نہ تجربہ ہے جوان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لیے ایک بڑے معاملہ فہم اور کار کردہ منشی کی ضرورت ہے۔

الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا۔ اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے۔ "مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی نہ کارکردگی کی اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بار بار پرکھ چکا ہوں۔ اب حُسن تقدیر اور حُسن اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آپ کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے زیادہ تامل نہ کیجیے، اس پر آہستہ سے دستخط کیجیے۔ میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا اوہی ندی کے کنارے والا بے مروت، سخت زبان تندمزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظروف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا۔ اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیے۔ الوپی دین فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور انھیں گلے لگا لیا۔

ہمدرد (اکتوبر ۱۹۱۳ء) پریم پچیسی میں شامل۔ ہندی میں اسی نام سے مان سرور ۸ میں ہے۔

پنچایت

جمن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی۔ لین دین میں بھی ساجھی تھا۔ ایک کو دوسرے پر کامل اعتماد۔ جمن جب حج کرنے کو گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے۔ اور الگو جب کبھی باہر جاتے تو جمن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے۔ وہ نہ ہم نوالہ تھے، نہ ہم پیالہ، نہ ہم مشرب۔ صرف ہم خیال تھے۔ اور یہی دوستی کی اصلی بنیاد ہے۔

اس دوستی کا آغاز اسی زمانے میں ہوا، جب دونوں لڑکے جمن کے پدر بزرگوار شیخ جمعراتی کے روبرو زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ الگو نے استاد کی بہت خدمت کی۔ خوب رکابیاں مانجھیں۔ خوب پیالے دھوئے۔ ان کا حقہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان خدمتوں میں شاگردانہ عقیدت کے سوا اور کوئی بھی خیال مضمر نہ تھا۔ جسے الگو خوب جانتے تھے۔ ان کے باپ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ تعلیم کے مقابلے میں انھیں استاد کی خدمت پر زیادہ بھروسہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ استاد کی دعا چاہیے۔ جو کچھ ہوتا ہے اس کے فیض سے ہوتا ہے۔ اور اگر الگو پر استاد کے فیض یا دعاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا تو اسے تسکین تھی کہ تحصیل علم کا کوئی دقیقہ اس نے فروگذاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقدیر ہی میں نہ تھا۔ شیخ جمعراتی خود دعا اور فیض کے مقابلے میں تازیانے کے زیادہ قائل تھے۔ اور جمن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اسی کا یہ فیض تھا کہ آج جمن کی قرب و جوار کے مواضعات میں پرستش ہوتی تھی۔ ان کے بیع نامے یا رہن نامے کے مسودات پر تحصیل کا عرائض نویس بھی قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ حلقہ کا پوسٹ مین، کانسٹبل اور تحصیل دار کا نذکوری یہ سب ان کے دستِ کرم کے محتاج تھے۔ اس لیے اگر الگو کو ان کی ثروت نے ممتاز بنا دیا تھا تو شیخ جمن بھی علم کی لازوال دولت کے باعث وقار کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

(۲)

شیخ جمن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھیں۔ ان کے پاس کچھ تھوڑی سی مِلک تھی۔ مگر قریبی وارث کوئی نہ

تھا۔ جمن نے وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملک اپنے نام کرالی تھی۔ جب تک ہبہ نامہ کی رجسٹری نہ ہوئی تھی خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوتی تھیں، خوب میٹھے لقمے اور چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے۔ مگر رجسٹری کی مہر ہوتے ہی ان کی خاطر داریوں پر بھی مہر ہوگئی۔ وہ وعدے وصال کے وعدے ثابت ہوئے۔ جمن کی اہلیہ بی فہیمن نے روٹیوں کے ساتھ کچھ تیز تیکھی باتوں کے سالن دینے بھی شروع کیے۔ اور رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے بڑھنے لگی۔ ''بڑھیا عاقبت کے بورے بٹورے گی کیا؟ دو تین بیگھے اوسر کیا دے دی ہے گویا مول لے لیا ہے۔ بگھاری دال بغیر روٹیاں نہیں اترتیں۔ جتنا روپیہ اس کے پیٹ میں جھونک چکے، اس سے تو اب تک کئی گاؤں مول لے لیتے۔'' کچھ دنوں تک خالہ جان نے سنا اور ضبط کیا۔ مگر جب برداشت نہ ہوئی تو جمن سے شکایت کی۔ جمن صلح پسند آدمی تھے۔ ''مقامی'' کارکن کے انتظام میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ دن اور یوں ہی رو دھو کر کام چلا۔ آخر ایک دن خالہ جان نے جمن سے کہا۔ ''بیٹا تمھارے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ تم مجھے روپے دے دیا کرو۔ میں اپنا الگ پکا لوں گی۔''

جمن نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ''روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے۔''

خالہ جان نے بگڑ کر کہا۔ ''تو مجھے نان نمک چاہیے یا نہیں؟''

جمن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا۔ ''چاہیے کیوں نہیں۔ میرا خون چوس لو۔ کوئی یہ تھوڑے ہی سمجھا تھا کہ تم خواجہ خضرؑ کی حیات لے کر آئی ہو۔''

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سن سکتی تھیں۔ جامے سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی۔ جمن ہنسے۔ وہ فاتحانہ ہنسی، جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے دیکھ کر نظر آتی ہے۔ کہا۔ ''ہاں ضرور پنچایت کرو، فیصلہ ہو جائے۔ مجھے بھی رات دن کا وبال پسند نہیں۔''

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اٹھے گی۔ اس کے متعلق شیخ جمن کو اندیشہ نہیں تھا۔ قرب و جوار میں ایسا کون تھا، جو ان کا شرمندۂ منت نہ ہو، کون تھا، جو ان کی دشمنی کو حقیر سمجھے۔ کس میں اتنی جرأت تھی، جو ان کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ آسمان کے فرشتے تو پنچایت کرنے آئیں گے نہیں! مریض نے آپ ہی دوا طلب کی۔

(۳)

اس کے کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لیے آس پاس کے گاؤں کے چکر لگاتی رہی۔ کمر جھک کر کمان

ہو گئی تھی۔ ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ مگر بات آ پڑی تھی۔ اس کا تصفیہ ضروری تھا۔ شیخ جمن کو اپنی طاقت، رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو گریہ وزاری کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مگر خوبیٔ تقدیر کوئی اس کی طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یوں ہی ہاں کر کے ٹال دیا۔ کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ ''ذرا اس ہوس کو تو دیکھو! قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں۔ آج مریں کل دوسرا دن ہوا۔ مگر صبر نہیں ہوتا۔ پوچھو اب تمھیں گھر بار، جگہ زمین سے کیا سروکار؟ ایک لقمہ کھاؤ ٹھنڈا پانی پیو۔ مالک کی یاد کرو۔'' سب سے بڑی بات ستم ظریفوں کی تھی۔ خمیدہ کمر، پوپلا منہ، سن جیسے سفید بال اور ثقلِ سماعت۔ جب اتنے تفریح کے سامان موجود ہوں تو ہنسی آنا ایک قدرتی امر ہے۔ غرض ایسے دور رس، انصاف پرور آدمیوں کی تعداد بہت کم تھی جنھوں نے خالہ جان کی فریاد کو غور سے سنا ہو۔ اور اس کی تشفی کی ہو۔ چاروں طرف گھوم گھام کر بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی۔ لاٹھی ٹیک دی۔ اور دم لے کر کہا۔ ''بیٹا! تم بھی چھن بھر کو میری پنچایت میں چلے آنا۔''

الگو بے رخی سے بولے۔ ''مجھے بلا کر کیا کرو گی۔ کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں ہی گے۔''

خالہ نے ہانپ کر کہا۔ ''اپنی فریاد تو سب کے کان میں ڈال آئی ہوں۔ آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے، ہمارے سد سالار گائے گہار سن کر پیڑھی سے اٹھ آئے تھے۔ کیا میرا رونا کوئی نہ سنے گا؟''

الگو نے جواب دیا۔ ''یوں آنے کو میں آ جاؤں گا۔ مگر پنچایت میں منہ نہ کھولوں گا۔''

خالہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں بیٹا۔''

الگو نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ ''اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت۔ جمن میرے پرانے دوست ہیں۔ ان سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔''

خالہ نے تاک کر نشانہ مارا۔ ''بیٹا کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟''

ہمارے سوئے ہوئے ایمان کی ساری جتھا چوری سے لٹ جائے، اسے خبر نہیں ہوتی۔ مگر کھلی ہوئی للکار سن کر وہ چونک پڑتا ہے۔ اور ہوشیار ہو جاتا ہے۔ الگو چودھری اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ کیا وہ ''نہیں'' کہنے کی جرأت کر سکتے تھے؟

(۴)

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی۔ ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ حقے پان کا بھی انتظام تھا۔ یہ سب شیخ

جمن کی مہمان نوازی تھی۔ وہ خود الگو چودھری کے ساتھ ذرا دور بیٹھے ہوئے حقے پی رہے تھے۔ جب کوئی آتا تھا ایک دبی ہوئی سلام علیک سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا کہ با اثر آدمیوں میں صرف وہی لوگ نظر آتے تھے جنھیں ان کی رضا جوئی کی کوئی پرواہ نہیں ہوسکتی تھی۔ کتنے مجلس کو دعوتِ احباب سمجھ کر جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو گئے تھے۔

جب پنچایت پوری بیٹھ گئی تو بوڑھی جی نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔

"پنچو! آج تین سال ہوئے۔ میں نے اپنی ساری جائداد اپنے بھانجے جمن کے نام لکھ دی تھی۔ اسے آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمن نے مجھے تاحیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سال چھ مہینے تو میں نے اس کے ساتھ کسی طرح رو دھو کر کاٹے۔ مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں۔ بے کس بیوہ ہوں۔ تھانہ کچہری کر نہیں سکتی۔ سوائے تم لوگوں کے کس سے اپنا دکھ درد روؤں۔ تم لوگ جو راہ نکال دو اس راہ چلوں۔ اگر میری برائی دیکھو، میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ جمن کی برائی دیکھو تو اسے سمجھاؤ۔ کیوں ایک بے کس کی آہ لیتا ہے؟"

رام دھن مصر بولے۔ "(ان کی کئی اسامیوں کو جمن نے توڑ لیا تھا۔) جمن میاں پنچ کسے بناتے ہو ابھی سے طے کر لو۔"

جمن نے حاضرین پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اپنے تئیں مخالفوں کے نرغے میں پایا۔ دلیرانہ انداز سے کہا۔ "خالہ جسے چاہیں پنچ بنائیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔"

خالہ نے چلا کر کہا۔ "ارے اللہ کے بندے تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا؟"

جمن نے بڑھیا کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اب اس وقت میری زبان نہ کھلواؤ۔ جسے چاہو پنچ بنا دو۔"

خالہ نے جمن کے اعتراض کو تاڑ لیا۔ بولیں۔ "بیٹا خدا سے ڈر۔ میرے لیے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا۔ اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہی دشمن ہیں؟ اچھا! اور سب کو جانے دے۔ الگو چودھری کو تو مانے گا؟"

جمن فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ مگر ضبط کر کے بولے۔ "الگو چودھری ہی سہی۔ میرے لیے جیسے رام دھن مصر ویسے الگو چودھری۔ کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔"

الگو بغلیں جھانکنے لگے۔ وہ اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔ معترضانہ انداز میں کہا۔ ''بوڑھی اماں! تم جانتی ہو کہ میری اور جمن کی گاڑھی دوستی ہے۔'' خالہ نے جواب دیا۔ ''بیٹا دوستی کے لیے کوئی ایمان نہیں کھوتا۔ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے منھ سے جو بات نکلتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے نکلتی ہے۔''

الگو کو کوئی چارہ نہ رہا۔ سرپنچ بنے۔ رام دھن مصر دل میں بڑھیا کو کوسنے لگے۔

الگو چودھری نے فرمایا۔ ''شیخ جمن! ہم اور تم پرانے دوست ہیں۔ جب ضرورت پڑی ہے تم نے میری مدد کی ہے اور ہم سے بھی جو کچھ بن پڑا ہے، تمھاری خدمت کرتے آئے ہیں۔ مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو اور نہ ہم تمھارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا۔ تم کو بھی جو کچھ کہنا ہو کہو۔''

جمن ایک شانِ فضیلت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

''پنچو! میں خالہ جان کو اپنی ماں کی جگہ سمجھتا ہوں۔ اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں عورتوں میں ذرا ان بن رہتی ہے۔ اس میں میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہوتی ہی ہے۔ مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے۔ کھیتوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے۔''

الگو چودھری کو آئے دن عدالت سے سابقہ رہتا تھا۔ قانونی آدمی تھے۔ جمن سے جرح کرنے لگے...... ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا۔ رام دھن مصر اور ان کے رفیق سر ہلا ہلا کر ان سوالوں کی داد دیتے تھے۔ جمن حیرت میں تھا کہ الگو کو کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھ کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ اچھی دوستی نباہی! اس سے اچھے تو رام دھن ہی تھے۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ کون کون سے کھیت کتنے پر اٹھتے ہیں۔ اور کیا نکاسی ہوتی ہے۔ ظالم نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ سنایا۔ لہجہ نہایت متین اور تحکمانہ تھا۔

''شیخ جمن! پنچوں نے اس معاملے پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر تمھاری ہے۔ کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمھیں چاہیے کہ خالہ جان کو ماہوار گزارے کا بندوبست کر دو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں۔ اگر تمھیں یہ منظور نہیں، تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا۔''

جمن نے فیصلہ سنا اور سناٹے میں آ گئے۔ احباب سے کہنے لگے۔ "بھئی اس زمانے میں یہی دوستی ہے کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے، اس کی گردن پر چھری پھیری جائے۔ اسی کو نیرنگئی روزگار کہتے ہیں۔ اگر لوگ ایسے دغاباز، جو فروش گندم نمانہ ہوتے۔ تو ملک پر یہ آفتیں کیوں آتیں۔ یہ ہیضہ اور پلیگ انہی مکاریوں کی سزا ہے۔"

مگر رام دھن مصر اور فتح خان اور جگلو سنگھ اس بے لاگ فیصلے کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اسی کا نام پنچایت ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ دوستی دوستی کی جگہ ہے۔ مقدم ایمان کا سلامت رکھنا ہے۔ ایسے ہی ستیہ وادیوں سے دنیا قائم ہے۔ ورنہ کب کی جہنم میں مل جاتی۔"

اس فیصلے نے الگو اور جمن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں۔ تناور درخت، حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب بھی ملتے تھے۔ مگر تیرو سپر کی طرح۔ جمن کے دل سے دوستی کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا۔ اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

(۵)

خوش قسمتی سے موقع بھی جلد مل گیا۔ پچھلے سال الگو بٹسیر کے میلے سے بیلوں کی ایک اچھی گوئیں مول لائے تھے۔ پچھائیں نسل کی خوب صورت بیل تھے۔ مہینوں تک قرب وجوار کے لوگ انہیں دیکھنے آتے رہے۔

اس پنچایت کے ایک مہینے بعد ایک بیل مر گیا۔ جمن نے اپنے دوستوں سے کہا۔ "یہ دغابازی کی سزا ہے۔ انسان صبر کر جائے، مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے۔" الگو کو اندیشہ ہوا کہ جمن نے اسے زہر دلوا دیا ہے۔ اس کے برعکس چودھرائن کو خیال تھا کہ اس پر کچھ کر دیا گیا ہے۔ چودھرائن اور فہیمن میں ایک دن زور شور سے ٹھنی۔ دونوں خاتونوں نے روانی بیان کی ندی بہا دی۔ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں۔ بارے جمن نے آگ بجھائی۔ بیوی کو ڈانٹا۔ اور رزم گاہ سے ہٹا لے گئے۔ ادھر الگو چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائن کی شیریں کلامیوں کی داد دی۔

اب ایک بیل کس کام کا۔ اس کا جوڑا بہت ڈھونڈا۔ مگر نہ ملا ناچار اسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی۔ گاؤں میں ایک سیٹھ تھے۔ وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے۔ گاؤں میں گڑ گھی بھرتے اور منڈی لے جاتے منڈی سے تیل نمک لاد کر لاتے گاؤں میں بیچتے۔ اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی۔ سوچے اسے لے لوں تو دن میں بلا کسی منت کے تین کھیوے ہوں۔ یہاں تو ایک ہی کے لالے رہتے ہیں۔ بیل دیکھا، گاڑی میں دوڑایا، بال بھونری کی پہچان کرائی، مول بھاؤ کیا۔ اور اپنے دروازے پر لا کر

باندھ دیا۔ دام کے لیے ایک مہینے کا وعدہ ہوا۔ چودھری بھی غرض مند تھے۔ گھاٹے کی کچھ پرواہ نہ کی۔

سمجھو نے نیا بیل پایا۔ تو پاؤں پھیلائے۔ دن میں تین تین چار چار کھیوے کرتے۔ نہ چارے کی فکر تھی۔ نہ پانی کی، بس کھیوؤں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے۔ وہاں کچھ سوکھا بھس ڈال دیا۔ اور غریب جانور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ پھر جوت دیا۔ الگو چودھری کے یہاں تھے تو چین کی بنسی بجتی تھی۔ راتب پاتے، صاف پانی، دلی ہوئی ارہر، بھوسہ کے ساتھ کھلی، کبھی کبھی گھی کا مزہ بھی مل جاتا۔ شام سویرے ایک آدمی کھریرا کرتا۔ بند کھجلاتا، جھاڑتا، پونچھتا، سہلاتا، کہاں وہ ناز ونعمت کہاں یہ آٹھوں پہر کی رپٹ، مہینے بھر میں بے چارے کا کچومر نکل گیا۔ یکہ کا جوا دیکھتے ہی بے چارے کا ہیاؤ چھوٹ جاتا۔ ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ لیکن اصیل جانور مار کی تاب نہ تھی۔ ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ جی نے دونا بوجھ لادا۔ دن بھر کا تھکا جانور، پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔ اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے۔ بیل جگر توڑ کر چلا۔ کچھ دور دوڑا۔ چاہا کہ ذرا دم لے۔ ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر۔ کئی کوڑے بڑی بے دردی سے لگائے۔ بیل نے ایک بار پھر زور لگایا۔ مگر طاقت نے جواب دے دیا۔ زمین پر گر پڑا۔ اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ سیٹھ جی نے بہت پیٹا۔ ٹانگ پکڑ کر کھینچی۔ نتھنوں میں لکڑی ٹھونس دی۔ مگر لاش نہ اٹھی۔ تب کچھ اندیشہ ہوا۔ غور سے دیکھا۔ بیل کو کھول کر الگ کیا۔ اور سوچنے لگے کہ گاڑی گھر کیوں کر پہنچے۔ بہت چیخے اور چلائے۔ مگر دیہات کا راستہ بچوں کی آنکھ ہے۔ سر شام سے بند۔ کوئی نظر نہ آیا۔ قریب کوئی گاؤں بھی نہ تھا۔ مارے غصے کے موئے بیل پر اور درّے لگائے۔ سسرے! تجھے مرنا تھا تو گھر پر مرتا۔ تو نے آدھے رستے میں دانت نکال دیے۔ اب گاڑی کون کھینچے۔ اس طرح خوب جلے بھنے۔ کئی بورے گڑ اور کئی کنستر گھی کے بیچے تھے۔ دو ڈھائی سو روپے کمر میں بندھے ہوئے تھے۔ گاڑی پر کئی بورے نمک کے تھے۔ چھوڑ کر جا بھی نہ سکتے تھے۔ گاڑی پر لیٹ گئے۔ وہیں رت جگا کرنے کی ٹھان لی۔ اور آدھی رات تک دل کو بہلاتے رہے حقہ پیا۔ گایا۔ پھر حقہ پیا۔ آگ جلائی۔ تاپا۔ اپنی دانست میں تو وہ جاگتے ہی رہے۔ مگر جب پو پھٹی۔ چونکے۔ اور کمر پر ہاتھ رکھا تو تھیلی ندارد۔ کلیجہ سن سے ہو گیا، کمر ٹٹولی۔ تھیلی کا پتہ نہ تھا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ صبح کو بہ ہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے یہ حادثۂ الم ناک سنا تو چھاتی پیٹ لی۔ پہلے تو خوب روئیں۔ پھر الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں۔ حفظ ماتقدم کی سوجھی۔ نگوڑے نے ایسا منحوس بیل دیا کہ سارے جنم کی کمائی لٹ گئی۔

اس واقعے کو کئی ماہ گزر گئے۔ الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگنے جاتے تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلائے ہوئے کتوں کی طرح چڑھ بیٹھتے۔ ''یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ فقیر ہوگئے۔ انھیں دام کی پڑی ہے۔ مردہ منحوس بیل دیا تھا۔ اس پر دام مانگتے ہیں۔ آنکھ میں دھول جھونک دی۔ مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا۔ نرا پونگا ہی سمجھ لیا ہے۔ کسی گڑھے میں منہ دھو آؤ۔ تب دام لینا۔ صبر نہ ہوتا ہو تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ مہینے کے بدلے دو مہینے جوت لو۔ اور کیا لوگے؟'' اس فیاضانہ فیصلے کے قدر دان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سن کر چودھری لوٹ آتے۔ مگر ڈیڑھ سو روپے سے اس طرح ہاتھ دھو لینا آسان کام نہ تھا۔ ایک بار وہ بھی بگڑے۔ سیٹھ جی گرم پڑے۔ سیٹھانی جی جذبہ کے مارے گھر سے نکل پڑیں۔ سوال و جواب ہونے لگے۔ خوب مباحثہ ہوا۔ مجادلہ کی نوبت پہنچی۔ سیٹھ جی نے گھر میں گھس کر کواڑ بند کر لیے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہو گئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا۔ سیٹھ جی کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا اور صلاح دی کہ پنچایت کرلو۔ جو کچھ طے ہو جائے، اسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہوگئے۔ الگو نے بھی حامی بھری۔ فیصلہ ہوگیا۔

پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں۔ تیسرے دن اسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

وہی شام کا وقت۔ کھیتوں میں کوؤں کی پنچایت لگی ہوئی تھی۔ امر متنازعہ یہ تھا کہ مٹر کی پھلیوں پر ان کا جائز استحقاق ہے یا نہیں۔ اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے، وہ رکھوالے لڑکے کی فریاد بے داد پر بلاغت آمیز ناراضگی کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔

درخت کی ڈالیوں پر طوطوں میں سرگرم مباحثہ ہو رہا تھا۔ بحث طلب یہ امر تھا کہ انسان کو انھیں من حیث القوم بے وفا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

پنچایت پوری آبیٹھی۔ تو رام دھن مصر نے کہا۔ ''اب کیوں دیر کی جائے۔ بولو چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بناتے ہو؟''

الگو نے منکسرانہ انداز سے جواب دیا۔ ''سمجھو سیٹھ ہی چن لیں۔''

سمجھو سیٹھ کھڑے ہوگئے۔ اور کڑک کر بولے۔ ''میری طرف سے شیخ جمن کا نام لکھ لو۔''

الگو نے پہلا نام جمن کا سنا اور کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ گویا کسی نے اچانک تھپڑ مار دیا۔ رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہہ پر پہنچ گئے۔ بولے۔ ''چودھری تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟''

چودھری نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔ ''نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔''

اس کے بعد چار نام اور تجویز کیے گئے۔ الگو پہلا چرکا کھا کر ہوشیار ہو گئے تھے۔ خوب جانچ کر انتخاب کیا۔ صرف سرپنچ کا انتخاب باقی تھا۔ الگو اس فکر میں تھے کہ اس مرحلے کو کیوں کر طے کروں۔ کہ یکا یک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گوڈر شاہ بولے۔ ''سمجھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو؟''

سمجھو کھڑے ہو گئے۔ اور اکڑ کر بولے۔ ''شیخ جمن کو۔''

رام دھن مصر نے چودھری کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا۔ الگو تمھیں کچھ عذر ہو، تو کہو۔''

الگو نے قسمت ٹھونک لی۔ حسرت ناک لہجے میں بولے۔ ''نہیں! مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔''

اپنی ذمے داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے۔ اور گمراہی کے عالم میں معتبر رہنما۔

ایک اخبار نویس اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا مجلس وزراء کو کتنی بے باکی اور آزادی سے اپنے تازیانۂ قلم کا نشانہ بناتا ہے۔ مگر ایسے موقع بھی آتے ہیں، جب وہ خود مجلس وزراء میں شریک ہوتا ہے۔ اس دائرے میں قدم رکھتے ہی اس کی تحریر میں ایک دل پذیر متانت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ذمے داری کا احساس ہے۔

ایک نوجوان عالمِ شباب میں کتنا بے فکر ہوتا ہے۔ والدین اسے مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسے ننگِ خاندان سمجھتے ہیں۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ہی وارفتہ مزاج، ننگِ خاندان، کتنا سلامت رو، کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔ یہ ذمے داری کا احساس ہے۔ یہ احساس ہماری نگاہوں کو وسیع کر دیتا ہے۔ مگر زبان کو محدود۔ شیخ جمن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمے داری کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا۔ میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں۔ میری آواز اس وقت حکم خدا ہے۔ اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیے حق اور راستی سے جَو بھر ٹلنا بھی مجھے دنیا اور دین دونوں ہی میں روسیاہ بنا دے گا۔

پنچایت شروع ہوئی۔ فریقین نے اپنے خیالات بیان کیے، جرح ہوئی، شہادتیں گزریں۔ فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی۔ جمن نے بہت غور سے سنا۔ اور تب فیصلہ سنایا۔

الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ! پنچوں نے تمھارے معاملے پر غور کیا۔ سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا

واجب ہے۔ جس وقت بیل ان کے گھر آیا، اس کو کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو آج سمجھو اسے واپس لینے کا ہرگز تقاضا نہ کرتے۔''

رام دھن مصر نے کہا۔ ''قیمت کے علاوہ ان سے کچھ تاوان بھی لیا جائے۔ سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کے مار ڈالا۔''

جمن نے کہا۔ ''اس کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔''

گوڈر شاہ نے کہا۔ ''سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیے۔ اس کا بہت نقصان ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔''

جمن بولے۔ ''اس کا بھی اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں یہ الگو چودھری کی بھل منسی پر منحصر ہے۔'' یہ فیصلہ سنتے ہی الگو چودھری پھولے نہ سمائے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور زور سے ہانک لگائی۔

''پنچ پرمیشری کی جے!''

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ اس نعرے کے ساتھ ان کی صدائے تحسین بھی سنائی دی۔ بہت مدھم گویا سمندر پار سے آئی ہو۔

ہر شخص جمن کے انصاف کی داد دے رہا تھا۔ انصاف اس کو کہتے ہیں! آدمی کا یہ کام نہیں۔ پنچ میں پرماتما بستے ہیں۔ یہ ان کی مایا ہے۔ پنچ کے سامنے کھوٹے کو کھرا بنانا مشکل ہے۔ گھنٹہ بھر کے بعد جمن شیخ الگو چودھری کے پاس آئے اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے۔

''بھیا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے، میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن، انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ بھی خدا کی شان ہے۔ مجھے یقین آ گیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔''

الگو رونے لگے۔ دل صاف ہو گیا۔ دوستی کا مرجھایا ہوا درخت پھر ہرا ہو گیا۔ اب وہ بالو کی زمین پر نہیں، حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

اردو ماہنامہ زمانہ مئی اور جون ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا پنچ پرمیشور کے عنوان سے، ہندی ماہنامہ سرسوتی جون ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ پریم بتیسی میں مان سروورے میں شامل ہے۔

شطرنج کی بازی

نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سبھی رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔ تو کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ اُمور سیاست میں، شعر و سخن میں طرزِ معاشرت میں، حرفت و صنعت میں، تجارت و تبادلہ میں، سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکینِ سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے، شعرا بوسہ و کنار میں مست، اہل حرفہ کلا بتوں اور اور چکن بنانے میں، اہل سیف تیتر بازی میں، اہل روزگار سرمہ و مسّی، عطر و تیل کی خرید و فروخت میں غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، علم و حکمت کی کن کن ایجادوں میں مصروف ہے، بر و بحر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہے، اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں۔ تیتروں میں پالیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں چوسر ہو رہی ہے، پو بارہ کا شور مچا ہوا ہے، کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔ فوجیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ نواب کا حال اس سے بدتر تھا وہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظ نفس کے نئے نئے لٹکے، نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقراء خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک اور چانڈو کے مزے لیتے تھے، رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اربابِ نشاط سے تلمذ کرتے تھے فکر کو جولان عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لیے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں جو اس دلیل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ ہاں جہلا انھیں جو چاہیں سمجھیں، دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکرِ معاش سے آزاد تھے، آخر اور کرتے ہی کیا، طلوع سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے پھر انھیں خبر نہ ہوتی تھی کہ کب دوپہر ہوا۔ کب سہ پہر۔ کب شام۔ گھر میں سے بار بار آدمی آ کر کہتا تھا

کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا چلو آتے ہیں دستر خوان بچھاؤ۔ مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے، یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے ہی میں رکھ جاتا تھا اور دونوں دوست، دونوں کام ساتھ ساتھ کر کے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا اس لیے انھیں کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے، ہرگز نہیں محلہ میں، گھر کے نوکر چاکروں میں، مہریوں، ماماؤں میں برابر حاسدانہ حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے گھر کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے، آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے۔ نہ دنیا کے کام کا۔ بس اسے دھوبی کا کتا سمجھو۔ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ حالاں کہ انھیں اس کے موقع مشکل سے ملتے۔ وہ سوتی رہتی تھیں کہ ادھر بازی جم جاتی تھی۔ رات کو سو جاتی تھیں تب کہیں مرزا جی گھر میں آتے تھے۔ ہاں جولا ہے کا غصہ ڈاڑھی پر اُتارا کرتی تھیں۔ نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں۔ کیا میاں نے پان مانگے ہیں؟ کہہ دو آ کر لے جائیں۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لے جا کر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کھلائیں، یہاں اُن کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔ مگر لطف یہ تھا کہ انھیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب کو نکھٹو، بگاڑو، ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا تو ماما سے کہا، جا کر مرزا جی کو بلا لا۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لا دیں۔ دوڑ جلدی کر، سر پھٹا جاتا ہے۔ ماما گئی۔ مرزا جی نے کہا چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا کہ جا کر کہہ کہ ابھی چلیے ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے یہاں چلی جائیں گی کچھ ان کے آنکھوں راستہ نہیں دیکھا ہے۔ مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی۔ بولے کیا ایسا دم لبوں پر ہے ذرا صبر نہیں آتا۔ حکیم صاحب کوئی چھو منتر کر دیں گے کہ ان کے آتے ہی آتے درد سر دفع ہو جائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا۔ ''ارے تو جا کر ذرا سن ہی آئیے نا! عورتیں نازک مزاج ہوتی ہی ہیں۔''

مرزا۔ ''جی ہاں کیوں نہ چلا جاؤں۔ دو کشتوں میں آپ کی مات ہوتی ہے۔''

میر۔ جی اس بھروسے نہ رہیے گا، وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے رہیں اور مات ہو جائے پر جایئے۔ کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لیے ان کا دل دکھایئے گا۔

مرزا۔ جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کر دوں۔

میر۔ میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جا کر سن آئیں۔

مرزا۔ ارے یار جانا پڑے گا حکیم کے یہاں۔ درد ورد خاک نہیں ہے۔ مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے۔

میر۔ کچھ بھی ہو ان کی خاطر تو کرنی ہی پڑے گی۔

مرزا۔ اچھا ایک چال اور چل لوں۔

میر۔ ہرگز نہیں۔ جب تک آپ سُن نہ آئیں گے۔ میں مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحب نے کراہتے ہوئے کہا۔ تمھیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے کہ چاہے کوئی مر بھی جائے پر اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے۔ نوج کوئی تم جیسا نرموہیا ہو۔

مرزا۔ کیا کروں، میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر آیا ہوں۔

بیگم۔ کیا جیسے خود نکھٹو ہیں ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں، ان کے بھی تو بال بچے ہیں کہ سب کا صفایا کر دیا۔

مرزا۔ بڑا لتی آدمی ہے۔ جب آ کر سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ دُتکار کیوں نہیں دیتے کتے کی طرح۔

مرزا۔ سبحان اللہ برابر کے آدمی ہیں۔ عمر میں رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے۔ لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ تو میں ہی دُتکارے دیتی ہوں ناراض ہو جائیں گے ہو جائیں۔ کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ (ماما سے) عباسی جا شطرنج اُٹھا لا۔

میر صاحب سے کہہ دینا میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ اب پھر منہ نہ دکھایئے گا۔

مرزا۔ ہائیں ہائیں کہیں ایسا غضب نہ کرنا، کیا ذلیل کراؤ گی کیا۔ ٹھہر عباسی، کم بخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔

بیگم۔ جانے کیوں نہیں دیتے۔ میرا ہی خون پیے جو روکے، اچھا اُسے روک لیا۔ مجھے روک لو تو جانوں یہ کہہ کر بیگم صاحبہ خود چلاتی ہوئی دیوان خانہ کی طرح چلیں۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہوگیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے، خدا کے لیے تمھیں شہید کربلا کی قسم میری ہی میت دیکھیے جو ادھر قدم رکھے۔ لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں پر یکا یک نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رُک گئے وہیں سے اندر کی طرف جھانکا۔ حسنِ اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب نے حسب ضرورت دو چار مہرے تبدیل کر دیے تھے اور اس وقت اپنی صفائی جتانے کے لیے۔ باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے، پر کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مراد ملی، اندر پہنچ کر بازی اُلٹا دی۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے کچھ باہر تب دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی۔ مہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے۔ پھر چوڑیوں کی جھنکار سنی تو سمجھ گئے بیگم صاحبہ بگڑ گئیں۔ چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا، تم نے غضب کر دیا۔

بیگم۔ اب مُوا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلہ سمجھ لیا ہے۔ اتنی لَو اگر خدا سے لگاتے تو ولی ہو جاتے۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں میں یہاں چولھے چکی کی فکر میں سر کھپاؤں، لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ جاتے ہو حکیم صاحب کے ہاں کہ اب بھی تامل ہے۔

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں جانے کے بدلے میر صاحب کے گھر پہنچے اور معذرت آمیز لہجہ میں، با دلِ پُر درد سارا ماجرا کہہ سنایا۔

میر صاحب ہنس کر بولے۔ اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب دردِ سر کا پیغام ماما لائی تھی کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ اُف! اتنی تمکنت! آپ نے انھیں بہت سر

چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ انھیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے ہیں، خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے، مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انھیں کیا مجاز! میرے یہاں دیکھیے۔ کبھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔

مرزا۔ خیر تو بتایئے اب کہاں جماؤ ہوگا۔

میر۔ اب کیا غم ہے، اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے۔ بس یہیں جمے گی۔

مرزا۔ لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا۔ جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا تب تو اتنی خفگی تھی گھر سے چلا آؤں گا تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔

میر۔ اجی بکنے دیجیے، دو چار دن میں خود بخود سیدھی ہو جائیں گی۔ ہاں آپ بھی ذرا تن جایئے۔

(۲)

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں اس لیے وہ اُن کے مشغلۂ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی انھیں جانے میں دیر ہو جاتی، یا کچھ السا تے تو سرود بہ مستاں یاد دہانیدن کے مصداق انھیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق، متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں، لیکن جب ان کے دیوان خانے میں بساط بچھنے لگی، اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج واقع ہونے لگا تو انھیں بڑی تشویش دامن گیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ پر جھانکنے کو بھی ترس جاتی تھیں سوچنے لگیں کیوں کر یہ بلا سر سے ٹلے؟

ادھر نوکروں میں بھی کانا پھوسی ہونے لگی، اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھا نہ سروکار۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا۔ کبھی پانی لانے کا کبھی برف لانے کا کبھی تمبا کو بھرنے کا حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب جا جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے، حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑے جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی، گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے یہاں تک کہ ایک کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے

ہیں۔ محلہ والے ہردم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہتیں مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پر کروں کیا؟ میرا کیا بس ہے؟

محلّہ میں جو دو چار بڑے بوڑھے آدمی تھے وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خیریت نہیں ہے۔ جب ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگئی۔ لچھن برے ہیں۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دہاڑے لٹتی تھی پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھنچی چلی آتی تھی اور یہاں سامانِ عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ۔ نقال۔ کتھک۔ اربابِ نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقنوں کی دوکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصارف کا یہ حال اور انگریز کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ادائیگی کو فکر نہ تھی یہاں تک کہ سالانہ خراج بھی نہ ادا ہو سکتا تھا۔ رزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا۔ دھمکیاں دیتا۔ مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا۔ کسی کے کانوں پر جوں نہ رینگتی تھی۔

خیر میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گزر گئے، نت نئے نئے نقشے حل کیے جاتے، نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کیے جاتے، کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہو جاتی تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی پر یہ شکررنجیاں بہت جلد رفع ہو جاتی تھیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے میر صاحب بساط اُٹھا کر اپنے گھر میں آ بیٹھتے اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر مل بیٹھتے۔ نیند ساری بدمزگیوں کو دور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آ پہنچا۔ میر صاحب کے ہوش اڑے، اوسان خطا ہو گئے، خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دوازے بند کر لیے اور نوکروں سے کہا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے پوچھا۔ گھر میں نہیں تو کہاں ہیں۔ کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے!

خدمت گار۔ یہ میں نہیں جانتا۔ گھر میں سے یہی جواب ملا ہے۔ کیا کام ہے؟

سوار۔ کام تجھے کیا بتاؤں، حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لیے کچھ سپاہی مانگے گئے ہیں،

جاگیردار ہیں کہ مذاق ہے۔

خدمت گار۔ اچھا تو تشریف لے جائیے۔ کہہ دیا جائے گا۔

سوار۔ کہنے سننے کی بات نہیں ہے۔ میں کل فوراً آؤں گا، اور تلاش کر کے لے جاؤں گا۔ اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہوگئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی سے بولے، اب کیا ہوگا؟

مرزا۔ بڑی مصیبت ہے کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔

میر۔ کم بخت کل پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

مرزا۔ قہر آسمانی ہے اور کیا۔ کہیں سپاہیوں کی مانگ ہوئی تو بن موت مرے، یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی تپ چڑھ آتی ہے۔

میر۔ یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھیے۔

مرزا۔ بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملیے ہی نہیں، دونوں آدمی غائب ہو جائیں، سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہوگی حضرت آ کر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جائیں گے۔

میر۔ بس بس آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ۔ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔

ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں تم نے خوب بہروپ بھرا۔

اُس نے جواب دیا۔ ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چر لی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے۔ صبح کا گیا پہر رات کو آئے گا۔

(۳)

اُس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے ڈبے میں گلوریاں بھرے، گومتی پار ایک پرانی ویران مسجد میں جا بیٹھتے جو شاید عہدِ مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں چلم، تمباکو، دریا لے لیے، اور مسجد میں پہنچے۔ دری بچھی۔ حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انھیں دین و دنیا کی فکر نہ رہتی تھی۔ کشت، شہ، پیٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا ان کے منہ

سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ کوئی چلہ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا ہوگا دو پہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نانبائی کی دکان پر کھانا کھا لیتے، اور ایک چلم حقہ پی کر پھر محوِ شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انھیں کھانے کی سُدھ بھی نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ تر ہوتی جاتی تھیں۔ کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں، شہر میں ہلچل مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لے کر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غم دزد اور غم کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ گھر چلتے تو گلیوں میں ہو جاتے کہ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ محلے والوں کو بھی ان کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی، یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی مرزا صاحب انھیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتا کمپنی کی فوج سامنے کی سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قرض کی علت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی چال تھی، جس سے آج ساری کمزور قومیں پابہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب۔ انگریزی فوجیں آ رہی ہیں۔

مرزا۔ آنے دیجیے، کشت بچائیے۔ یہ کشت۔

میر۔ ذرا دیکھنا چاہیے، آڑ سے دیکھیں، کیسے قوی ہیکل جوان ہیں۔ دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔

مرزا۔ دیکھ لیجیے گا، کیا جلدی ہے۔ پھر کشت۔

میر۔ توپ خانہ بھی ہے، کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔ سُرخ چہرہ جیسے لال بندر۔

مرزا۔ جناب حیلے نہ کیجیے یہ کشت۔

میر۔ جب گھر چلنے کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات۔

فوج نکل گئی یاروں نے دوسری بازی بچھا دی۔ مرزا جی بولے آج کھانے کی کیسی رہے گی۔؟

میر۔ آج روزہ ہے کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے۔

میر۔ شہر میں کچھ نہ ہو رہا ہوگا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوں گے۔

حضور جانِ عالم بھی استراحت فرماتے ہوں گے، یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو۔

اب کی دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کی مرزا جی کی بازی کمزور تھی، اس اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے تھے اور فوج انھیں گرفتار کیے لیے جاتی تھی، شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا، نہ کشت وخون یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے، بیگمیں روئیں، نواب روئے، مامائیں، مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ازل سے کسی ملک میں کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہوگی۔ کم از کم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں، یہ وہ اہنسا نہ تھی جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں، یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں، لکھنؤ کا فرماں روا قیدی بنا چلا جاتا تھا، اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا۔ حضور عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے۔

میر۔ ہوگا۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ لیجیے شہ۔

مرزا۔ حضرت ذرا ٹھہریے، اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی۔ حضور عالی۔ خون کے آنسو روتے جاتے ہوں گے۔ لکھنؤ کا چراغ آج گل ہو گیا۔

میر۔ رویا ہی چاہیں، یہ عیش قیدِ فرنگ میں کہاں میسر۔ یہ شہ۔

مرزا۔ کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے۔ کتنی سخت مصیبت ہے، بلائے آسمانی۔

میر۔ ہاں ہے ہی، پھر کشت بس دوسری کشت میں مات ہے، بچ نہیں سکتے۔

مرزا۔ آپ بڑے بے درد ہیں واللہ! ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے حضور جان عالم اب کمال کا کوئی قدرداں نہ رہا۔ لکھنؤ بھی ویران ہو گیا۔

میر۔ پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے پھر حضور پُر نور کا ماتم کیجیے گا۔ یہ کشت اور مات، لانا ہاتھ۔

نواب کو لیے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی، ان کے جاتے ہی مرزا جی نے نئی بازی بچھا دی۔ ہار کی چوٹ بُری ہوتی ہے، میر صاحب نے کہا۔ آیئے نواب صاحب کی حالتِ زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں، لیکن مرزا جی کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ وہ شکست

کا انتقام لینے کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔

(۴)

شام ہوگئی مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کیا، ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نمازِ مغرب ادا کرنے لگیں، دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے، گویا دو خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا جی متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے اور اس چوتھی بازی کا رنگ بھی اچھا نہ تھا وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے خوب سنبھل سنبھل کر، طبیعت پر خوب زور دے دے کر کھیلتے تھے لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی کہ ساری بازی بگڑ جاتی، ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے تھے، ٹھمریاں گاتے تھے، چٹکیاں لیتے تھے، آوازے کستے تھے، ضلع اور جگت میں کمال دکھاتے تھے۔ ایسے خوش تھے گویا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا ہے، مرزا صاحب ان کی یہ خوش فعلیاں سن سن کر جھنجھلاتے تھے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے آپ چال نہ تبدیل کیا کیجیے۔ یہ کیا کہ چال چلے اور فوراً بدل دی جو کچھ کرنا ہو، ایک بار خوب غور کر کے کیجیے۔ جناب آپ میرے مہرے پر انگلی کیوں رکھے رہتے ہیں۔ مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجیے۔ جب تک دل میں چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرہ کو ہاتھ نہ لگایا کیجیے۔ حضرت آپ ایک ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی بند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں اس کی مات سمجھی جائے، پھر آپ نے چال بدلی؟ مہرہ وہیں رکھ دیجیے۔

میر صاحب کا فرزی پٹا جاتا تھا، بولے میں نے چال چلی کب تھی؟

مرزا۔ آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجیے۔

میر۔ اُس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوڑا کب تھا؟

مرزا۔ آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوڑیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔ فرزی پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر۔ دھاندلی آپ کرتے ہیں ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے، دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتا۔

مرزا۔ یہ بازی آپ کی مات ہوگئی۔

میر۔ میری مات کیوں ہونے لگی۔

مرزا۔ تو آپ مہرہ اُسی گھر میں رکھ دیجیے جہاں پہلے رکھا تھا۔

میر۔ وہاں کیوں رکھوں، نہیں رکھتا۔

مرزا۔ آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میر۔ ہرگز نہیں۔

مرزا۔ رکھیں گے تو آپ کے فرشتے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بات بڑھ گئی۔ دونوں اپنی ٹیک کے دھنی تھے، نہ یہ دبتا تھا نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشا ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔ مرزا جی نے فرمایا، اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے، وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کیے آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلئے گا۔ ریاست شے دیگر ہے۔ جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔

میر۔ گھانس آپ کے ابا جان چھیلتے ہوں گے، یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گزر گئیں۔

مرزا۔ اجی جائیے۔ نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گری کرتے کرتے عمر گزر گئی۔ اس طفیل میں جاگیر پا گئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چرایا ہے۔ رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔

میر۔ کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوں گے۔ ہمارے بزرگ تو نواب کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔

مرزا۔ بے حیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی۔

میر۔ زبان سنبھالیے ورنہ بُرا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہیں۔ کسی نے آنکھ دکھائی اور ہم نے دیا تلا ہوا ہاتھ۔ بھنڈارا کھل گیا ہے۔

مرزا۔ آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے، تو سنبھل جائیے۔ تقدیر آزمائی ہو جائے ادھر یا اُدھر۔

میر۔ ہاں ہاں آجاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے۔

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکال لیں۔ ادنیٰ و اعلیٰ سبھی کٹار خنجر پیش قبض شیر بچہ باندھتے تھے، دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لیے، سلطنت کے لیے، قوم کے لیے کیوں مریں؟ کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا بلکہ وہ قوی تر ہو گئے تھے۔ دونوں نے پینترے بدلے لکڑی اور گتکہ کھیلے ہوئے تھے۔ تلواریں چمکیں۔ جھپا جھپ کی آواز آئی، اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے، دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لیے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انھیں دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لیے اپنی گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہو گیا تھا بازی بچھی ہوئی تھی دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔

چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بوسیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگورے اور سربسجود مناران لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کے بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے جس میں سنگ وخشت کا ثبات بھی نہیں۔

یہ افسانہ ہندی ماہ نامہ مادھوری اکتوبر ۱۹۲۴ میں شائع ہوا اور اردو میں زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۲۴ میں شائع ہوا، ہندی میں مان سرودر ۳ اور اردو میں خواب وخیال میں شامل ہے۔

سوا سیر گیہوں

کسی گاؤں میں شنکر نامی ایک کرمی کسان رہتا تھا۔ سیدھا سادہ غریب آدمی تھا اپنے کام سے کام، نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ چھکا پنجانہ جانتا تھا، چھل کپٹ کی اُسے چھوت بھی نہ لگی تھی، ٹھگے جانے کی فکر نہ تھی۔ وِدّیا نہ جانتا تھا، کھانا ملاتو کھالیا نہ ملاتو چربن پر قناعت کی۔ چربن بھی نہ ملاتو پانی پی لیا اور رام کا نام لے کر سو رہا۔ مگر جب کوئی مہمان دروازے پر آجاتا تھا تو اُسے یہ استغنا کا راستہ ترک کر دینا پڑتا تھا، خصوصاً جب کوئی سادھو مہاتما آجاتے تھے تو اُسے لازماً دنیاوی باتوں کا سہارا لینا پڑتا۔ خود بھوکا سو سکتا تھا۔ مگر سادھو کو کیسے بھوکا سلاتا۔ بھگوان کے بھگت ٹھہرے۔

ایک روز شام کو ایک مہاتما نے آکر اُس کے دروازے پر ڈیرا جمایا۔ چہرہ پُر جلال تھا، پیتامبر گلے میں، جٹا سر پر، پیتل کا کمنڈل ہاتھ میں، کھڑاؤں پیر میں، عینک آنکھوں پر، غرض یہ کہ پورا بھیس اُن مہاتماؤں کا سا تھا جو رؤسا کے محلوں میں ریاضت، ہوا گاڑیوں پر مندروں کا طواف اور یوگ (مراقبہ) میں کمال حاصل کرنے کے لیے لذیذ غذائیں کھاتے ہیں! گھر میں جو کا آٹا تھا، وہ انھیں کیسے کھلاتا؟ زمانۂ قدیم میں جو کی خواہ کچھ اہمیت رہی ہو۔ مگر زمانۂ حال میں جو کی خورش مہاتما لوگوں کے لیے ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہے۔ بڑی فکر ہوئی کہ مہاتما جی کو کیا کھلاؤں؟ آخر طے کیا کہ کہیں سے گیہوں کا آٹا اُدھار لاؤں، گاؤں بھر میں گیہوں کا آٹا نہ ملا۔ گاؤں بھر میں سب آدمی ہی آدمی تھے، دیوتا ایک بھی نہ تھا، پس وہاں دیوتاؤں کی خورش کیسے ملتی؟ خوش قسمتی سے گاؤں کے پروہت جی کے یہاں تھوڑے سے گیہوں مل گئے۔ اُن سے سوا سیر گیہوں اُدھار لیے اور بیوی سے کہا کہ پیس دے۔ مہاتما نے کھایا۔ لمبی تان کر سوئے اور صبح آشیرواد دے کر اپنا راستہ لیا۔

پروہت جی سال میں دو بار کھلیانی لیا کرتے تھے۔ شنکر نے دل میں کہا کہ سوا سیر گیہوں کیا لوٹاؤں پنسیری کے بدلے کچھ زیادہ کھلیانی دے دوں گا۔ یہ بھی سمجھ جائیں گے، میں بھی سمجھ جاؤں گا۔ چیت میں جب پروہت جی پہنچے تو انھیں ڈیڑھ پنسیری کے قریب گیہوں دے دیا اور اپنے کو سبکدوش سمجھ کر اس کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ پروہت جی نے بھی پھر کبھی نہ مانگا۔ سیدھے سادے شنکر کو کیا معلوم تھا کہ یہ سوا سیر گیہوں چکانے کے لیے مجھے دوبارہ جنم لینا پڑے گا؟

سات سال گزر گئے۔ پروہت جی برہمن سے مہاجن ہوئے، شنکر کسان سے مزدور ہو گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی منگل اس سے الگ ہو گیا تھا۔ ایک ساتھ رہ کر دونوں کسان تھے، الگ ہو کر دونوں مزدور ہو گئے تھے۔ شنکر نے بہت چاہا کہ نفاق کی آگ بھڑکنے نہ پاوے۔ مگر حالات نے اس کو مجبور کر دیا۔ جس وقت الگ چولھے جلے وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ آج سے بھائی بھائی دشمن ہو جائیں گے۔ ایک روئے گا، دوسرا ہنسے گا، ایک کے گھر غمی ہوگی تو دوسرے کے گھر گلگلے پکیں گے۔ محبت کا رشتہ، خون کا رشتہ، دودھ کا رشتہ، آج ٹوٹا جاتا ہے۔ اُس نے سخت محنت کر کے خاندانی عزت کا یہ درخت لگایا تھا، اُسے اپنے خون سے سینچا تھا، اس کا جڑ سے اُکھڑنا دیکھ کر اس کے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ سات روز تک اُس نے دانے کی صورت بھی نہ دیکھی۔ دن بھر جیٹھ کی دھوپ میں کام کرتا اور رات میں منہ لپیٹ کر سو رہتا۔ اس سخت رنج اور ناقابل برداشت تکلیف نے خون کو جلا دیا، گوشت اور چربی کو گھلا دیا، بیمار پڑا تو مہینوں چارپائی سے نہ اُٹھا۔ اب گزر بسر کیسے ہو؟ پانچ بیگھے کے آدھے کھیت رہ گئے۔ ایک بیل رہ گیا کھیتی کیا خاک ہوتی؟ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ کھیتی صرف نام بھر رہ گئی، معاش کا سارا بار مزدوری پر آ پڑا۔

سات سال گزر گئے۔ ایک دن شنکر مزدوری کر کے لوٹا تو راستہ میں پروہت جی نے ٹوک کر کہا۔ شنکر کل آ کے اپنے بیج بینک کا حساب کر لے۔ تیرے یہاں ساڑھے پانچ من گیہوں کب سے باقی پڑے ہیں اور تو دینے کا نام نہیں لیتا۔ کیا ہضم کرنے کی نیت ہے کیا؟

شنکر نے تعجب سے کہا۔ میں نے تم سے کب گیہوں لیے تھے جو ساڑھے پانچ من ہو گئے؟ تم بھولتے ہو۔ میرے یہاں نہ کسی کا چھٹانک بھر اناج ہے، نہ ایک پیسہ اُدھار۔

پروہت۔ اسی نیت کا تو پھل بھوگ رہے ہو کہ کھانے کو نہیں جُرتا۔

یہ کہہ کر پروہت جی نے اُس سوا سیر گیہوں کا ذکر کیا جو آج سے سات سال قبل شنکر کو دیے تھے۔ شنکر سن کر ساکت رہ گیا۔ ایشور میں نے انھیں کتنی بار کھلیانی دی، انھوں نے میرا کون سا کام کیا، جب پوتھی پترا دیکھنے، ساعت شگون بچارنے دوار پر آتے تھے تو کچھ نہ کچھ دچھنا لے ہی جاتے تھے۔ اتنا سوارتھ! سوا سیر اناج کو انڈے کی طرح سے کر آج یہ بھوت کھڑا کر دیا جو مجھے نگل ہی جائے۔ اتنے دنوں میں ایک بار بھی کہہ دیتے تو میں گیہوں دے ہی دیتا۔ کیا اسی نیت سے چپ بیٹھے رہے؟ بولا۔ مہاراج نام لے کر تو میں نے اتنا اناج نہیں دیا، مگر کئی بار کھلیانی میں سیر دو سیر دے دیا ہے۔ اب آج ساڑھے پانچ من مانگتے ہیں، میں کہاں سے دوں گا؟

پروہت۔ لیکھا جو جو۔ بکسیس سو سو، تم نے جو کچھ دیا ہوگا کھلیانی میں دیا ہوگا، اُس کا کوئی حساب نہیں چاہے ایک کی جگہ چار پنسیری دے دو، تمھارے نام ہی میں ساڑھے پانچ من

لکھا ہوا ہے۔ جس سے چاہے حساب لگوالو۔ دے دو تو تمھارا نام جھیک (کاٹ) دوں، نہیں تو اور بڑھتا رہے گا۔

شنکر۔ پانڈے! کیوں ایک غریب کو ستاتے ہو؟ میرے کھانے کا ٹھکانہ نہیں، اتنا گیہوں کس کے گھر سے دوں گا؟

پروہت۔ جس کے گھر سے چاہے لاؤ، میں چھٹانک بھر بھی نہ چھوڑوں گا۔ یہاں نہ دو گے، بھگوان کے گھر تو دو گے؟

شنکر کانپ اُٹھا۔ ہم پڑھے لکھے لوگ ہوتے تو کہہ دیتے ''اچھی بات ہے، ایشور کے گھر ہی دیں گے، وہاں کی تول یہاں سے کچھ بڑی تو نہ ہوگی۔ کم سے کم اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں پھر اس کی کیا فکر؟'' مگر شنکر اتنا عقل مند، اتنا چالاک نہ تھا۔ ایک تو قرض وہ بھی برہمن کا! بہی میں نام رہے گا تو سیدھے نرک میں جاؤں گا۔ اس خیال سے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بولا۔ مہاراج تمھارا جتنا ہوگا، یہیں دوں گا۔ ایشور کے یہاں کیوں دوں؟ اس جنم میں تو ٹھوکر کھا ہی رہا ہوں، اُس جنم کے لیے کیوں کانٹے بوؤں؟ مگر یہ کوئی نیائے نہیں ہے۔ تم نے رائی کا پربت بنا دیا، برہمن ہو کے تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اُسی گھڑی تگادا کر کے لے لیا ہوتا تو آج میرے اوپر اتنا بڑا بوجھ کیوں پڑتا؟ میں تو دے دوں گا۔ لیکن تمھیں بھگوان کے یہاں جواب دینا پڑے گا۔

پروہت۔ وہاں کا ڈر تمھیں ہوگا، مجھے کیوں ہونے لگا؟ وہاں تو سب اپنے بھائی بند ہیں۔ رشی منی سب تو برہمن ہی ہیں۔ جو کچھ بنے بگڑے گی، سنبھال لیں گے تو کب۔

شنکر۔ میرے پاس دھرا تو ہے نہیں، کسی سے مانگ جانچ کر لاؤں گا تبھی دوں گا۔

پروہت۔ میں یہ نہ مانوں گا۔ سات سال ہو گئے۔ اب ایک دن کا بھی ملاحظہ نہ کروں گا۔ گیہوں نہیں دے سکتے تو دستاویز لکھ دو۔

شنکر۔ مجھے تو دینا ہے۔ چاہے گیہوں لو۔ چاہے دستاویز لکھاؤ۔ کس حساب سے دام رکھو گے؟

پروہت۔ بازار جاؤ، پانچ سیر کا ہے، تمھیں سوا پانچ سیر کا کاٹ دوں گا؟

شنکر۔ جب دے ہی رہا ہوں تو بازار بھاؤ کاٹوں گا۔ پاؤ بھر چھڑا کر کیوں بُرا بنوں؟

حساب لگایا گیا تو گیہوں کی قیمت ساٹھ روپے ہوئی۔ ساٹھ کا دستاویز لکھا گیا، تین روپیہ سیکڑہ سود۔ سال بھر میں نہ دینے پر سود کی شرح ساڑھے تین روپے سیکڑہ۔ آٹھ آنے کا اسٹامپ، ایک روپیہ دستاویز کی تحریر شنکر کو علاوہ دینی پڑی۔

سارے گاؤں نے پروہت جی کی مذمت کی مگر سامنے نہیں، مہاجن سے سبھی کا کام پڑتا ہے۔ اُس

کے منہ کون لگے؟

شنکر نے سال بھر تک سخت ریاضت کی۔ میعاد سے قبل اس نے روپے ادا کرنے کا برت سا کرلیا۔ دوپہر کو پہلے بھی چولھا نہ جلتا تھا۔ صرف چربن پر بسر ہوتی تھی اب وہ بھی بند ہوا۔ صرف لڑکے کے لیے رات کو روٹیاں رکھ دی جاتیں۔ ایک پیسہ روز کی تمباکو پی جاتا تھا۔ یہی ایک لت تھی جسے وہ کبھی نہ چھوڑ سکا تھا۔ اب وہ بھی اس کٹھن برت کے بھینٹ ہوگئی۔ اُس نے چلم پٹک دی۔ حقہ توڑ دیا اور تمباکو کی ہانڈی چور چور کرڈالی۔ کپڑے پہلے بھی ترک کے انتہائی حد تک پہنچ چکے تھے، اب وہ باریک ترین قدرتی کپڑوں میں منسلک ہوگئے۔ ماگھ کی ہڈیوں تک میں سرایت کرجانے والی سردی کو اُس نے آگ کے سہارے کاٹ دیا۔ اس اٹل ارادہ کا نتیجہ اُمید سے بڑھ کر نکلا۔ سال کے آخر تک اُس کے پاس ساٹھ روپے جمع ہوگئے۔ اس نے سمجھا کہ پنڈت جی کو اتنے روپے دے دوں گا اور کہوں گا، مہاراج باقی روپے بھی جلد ہی آپ کے سامنے حاضر کردوں گا۔ پندرہ کی تو اور بات ہے۔ کیا پنڈت جی اتنا بھی نہ مانے گا؟ اس نے روپے لیے اور لے جاکر پنڈت جی کے قدموں پر رکھ دیے۔

پنڈت جی نے متعجب ہوکر پوچھا۔ کسی سے اُدھار لیے کیا؟

شنکر۔ نہیں مہاراج! آپ کی اسیس سے اب کی مجوری اچھی ملی۔

پنڈت۔ لیکن یہ تو ساٹھ ہی ہیں۔

شنکر۔ ہاں مہاراج، اتنے ابھی لے لیجیے باقی میں دو تین مہینے میں دے دوں گا۔ مجھے اُرن کردیجیے۔

پنڈت۔ ارن تو جبھی ہوگے جب میری کوڑی کوڑی چکا دوگے۔ جاکر میرے پندرہ اور لاؤ۔

شنکر۔ مہاراج۔ اتنی دیا کرو۔ اب سانجھ کی روٹیوں کا بھی ٹھکانا نہیں ہے گاؤں میں ہوں تو کبھی نہ کبھی دے ہی دوں گا۔

پنڈت۔ میں یہ روگ نہیں پالتا۔ نہ بہت باتیں کرنا جانتا ہوں۔ اگر میرے پورے روپے نہ ملیں گے تو آج سے بڑھتے تین روپے سیکڑہ کا بیاج چلے گا۔ اتنے روپے چاہے اپنے گھر میں رکھو چاہے میرے ہاں چھوڑ جاؤ۔

شنکر۔ اچھا، جتنا لایا ہوں اتنا رکھ لیجیے۔ میں جاتا ہوں کہیں سے پندرہ اور لانے کی پھکر کرتا ہوں۔

شنکر نے سارا گاؤں چھان مارا، مگر کسی نے روپے نہ دیے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا اعتبار نہ تھا، یا کسی کے پاس روپے نہ تھے بلکہ پنڈت جی کے شکار کو چھیڑنے کی کسی کو ہمت نہ تھی۔

عمل کے بعد ردِعمل کا قاعدہ قدرتی ہے۔ شنکر سال بھر تک تپسیا کرنے پر بھی جب قرض بے باق

کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ تو اس کی احتیاط مایوسی کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ جب اتنی تکلیف اُٹھانے پر بھی سال بھر میں ساٹھ روپے سے زیادہ نہ جمع کر سکا تو اب اور کون سا اُپائے ہے جس سے اُس کے دونے روپے جمع ہوں۔ جب سر پر قرض کا بوجھ ہی لدنا ہے تو کیا من بھر اور کیا سوا من کا، اس کی ہمت پست ہوگئی۔ محنت سے نفرت ہوگئی۔ امید ہی حوصلہ پیدا کرنے والی ہے۔ امید رونق ہے، طاقت ہے، زندگی ہے۔ امید ہی دنیا کو متحرک کرنے والی قوت ہے۔ شنکر مایوس ہو کر بے پروا ہو گیا۔ وہ ضرورتیں جن کو اُس نے سال بھر تک ٹال رکھا تھا، اب دروازے پر کھڑی ہونے والی بھکارنیں نہ تھیں بلکہ سر پر سوار ہونے والی چڑیلیں تھیں جو اپنا چڑھاوا لیے بغیر جان ہی نہیں چھوڑتیں۔ کپڑوں میں پیوند لگنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب شنکر کو حساب ملتا تو وہ روپے جمع نہ کرتا۔ کبھی کپڑے لاتا اور کبھی کوئی کھانے کی چیز جہاں پہلے تمبا کو ہی پیا کرتا تھا، وہاں اب گانجہ اور چرس کا چسکا بھی لگا۔ اُسے اب روپے ادا کرنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ گویا اُس پر کسی کا ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ پہلے لرزہ آجانے پر بھی وہ کام کرنے ضرور جاتا تھا اب کام پر نہ جانے کا بہانہ تلاش کیا کرتا تھا۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ پنڈت جی مہاراج نے ایک بار بھی تقاضہ نہ کیا۔ وہ ہوشیار شکاری کی طرح تیر بہ ہدف نشانہ لگانا چاہتے تھے، پہلے سے شکار کو بھڑ کا دینا اُن کے شیوہ کے خلاف تھا۔

ایک روز پنڈت جی نے شنکر کو بلایا۔ حساب دکھایا۔ ساٹھ روپے جو جمع تھے وہ منہا کرنے پر اب بھی شنکر کے ذمہ ایک سو بیس روپے نکلے؟

اتنے روپے تو اُسی جنم میں دوں گا۔ اس جنم میں نہیں ہوسکتا۔

پنڈت۔ میں اسی جنم میں لوں گا۔ اصل نہ سہی، سود تو دینا ہی پڑے گا۔

شنکر۔ ایک بیل ہے وہ لے لیجیے۔ ایک جھونپڑی ہے وہ لے لیجیے اور میرے پاس رکھا کیا ہے؟

پنڈت۔ مجھے بیل بدھیا لے کر کیا کرنا ہے۔ مجھے دینے کو تمھارے پاس بہت کچھ ہے۔

شنکر۔ اور کیا ہے، مہاراج!

پنڈت۔ کچھ نہیں ہے۔ تم تو ہو؟ آخر تم بھی کہیں مزدوری کرنے جاتے ہی ہو، مجھے بھی کھیتی کے لیے ایک مزدور رکھنا ہی پڑتا ہے۔ سود میں تم ہمارے یہاں کام کیا کرو۔ جب سبیتا ہو اصل بھی دے دینا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تم کسی دوسری جگہ کام کرنے نہیں جاسکتے۔ جب تک میرے روپے نہ چکا دو۔ تمھارے پاس کوئی جائیداد نہیں ہے، اتنی بڑی گٹھری

میں کس اعتبار پر چھوڑ دوں؟ کون اس کا ذمہ لے گا تم مجھے مہینے مہینے سود دیتے جاؤ گے؟ اور کہیں کما کر جب تم مجھے سود بھی نہیں دے سکتے تو اصل کی کون کہے؟

شنکر۔ مہاراج، سود میں تو کام کروں گا اور کھاؤں گا کیا؟

پنڈت۔ تمھاری گھر والی ہے، لڑکے ہیں، کیا وہ ہاتھ پیر کٹا کر بیٹھیں گے؟ تمھیں آدھ سیر جَو روز چربن کے لیے دے دیا کروں گا۔ اوڑھنے کو سال میں کمل پا جاؤ گے۔ ایک سلوکا بھی بنوا دیا کروں گا اور کیا چاہیے؟ یہ سچ ہے کہ اور لوگ تمھیں آنے روز دیتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسی غرض نہیں ہے۔ میں تو تمھیں اپنے روپے بھرانے کے لیے رکھتا ہوں۔

شنکر نے کچھ دیر تک گہرے سوچ میں پڑے رہنے کے بعد کہا۔ مہاراج، یہ تو جنم بھر کی گلامی ہوئی۔

پنڈت۔ گلامی سمجھو چاہے مجبوری سمجھو، میں اپنے روپے بھرائے بنا تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔ تم بھاگو گے تو تمھارا لڑکا بھرے گا۔ ہاں جب کوئی نہ رہے گا، تب کی بات دوسری ہے۔

اس فیصلہ کی کہیں اپیل نہ تھی، مزدور کی ضمانت کون کرتا؟ کہیں پناہ نہ تھی، بھاگ کر کہاں جاتا؟ دوسرے روز سے اُس نے پنڈت جی کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ سوا سیر گیہوں کی بدولت عمر بھر کے لیے غلامی کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالنی پڑیں۔ اُس بدنصیب کو اب اگر کسی خیال سے تسکین ہوتی تھی تو اسی سے کہ یہ سب میرے پچھلے جنم کا بھوگ ہے۔ عورت کو وہ کام کرنے پڑتے تھے جو اس نے کبھی نہ کیے تھے۔ بچے دانہ دانہ کو ترستے تھے۔ لیکن شنکر چپ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا تھا، وہ گیہوں کے دانے کسی دیوتا کی بددعا کی طرح تمام عمر اُس کے سر سے نہ اُترے۔

شنکر نے پنڈت جی کے یہاں بیس برس تک غلامی کرنے کے بعد اس غم کدہ سے رحلت کی۔ ایک سو بیس ابھی تک اُس کے سر پر سوار تھے۔ پنڈت جی نے اس غریب کو ایشور کے دربار میں تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا وہ اتنے بے درد اور بے انصاف نہ تھے۔ پس انھوں نے اس کے جوان بیٹے کی گردن پکڑی۔ آج تک وہ پنڈت جی کے یہاں کام کرتا ہے۔ اُس کا اُودھار کب ہوگا، ہوگا بھی یا نہیں، ایشور ہی جانے۔

ناظرین! اس قصہ کو فرضی نہ سمجھیے۔ یہ سچا واقعہ ہے۔ ایسے شنکروں اور ایسے پروہتوں سے دنیا خالی نہیں ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار ماہنامہ 'چاند' کے نومبر ۱۹۲۴ کے شمارہ میں شائع ہوا۔ ہندی میں مان سروور ۴ اور اردو میں 'فردوس خیال' میں شامل ہے۔

مندر اور مسجد

چودھری عطرت علی ''گڑے'' کے بڑے جاگیردار تھے۔ ان کے بزرگوں نے شاہی زمانے میں انگریزی سرکار کی بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں۔ ان کے بدلے میں یہ جاگیر ملی تھی۔ اپنے سو پر بندھ (حسن انتظام) سے انھوں نے اپنی ملکیت اور بھی بڑھالی تھی اور اب اس علاقے میں ان سے زیادہ دھنی منی (متمول معزز) کوئی آدمی نہ تھا۔ انگریز حکام جب علاقے میں دورہ کرنے جاتے تو چودھری صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ضرور آتے تھے۔ مگر چودھری صاحب خود کسی حاکم کو سلام کرنے نہ جاتے، چاہے وہ کمشنر ہی کیوں نہ ہو۔ انھوں نے کچہریوں میں نہ جانے کا ورت (عہد) سا کرلیا تھا۔ کسی اجلاس، دربار میں بھی نہ جاتے تھے۔ کسی حاکم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اس کی ہر ایک بات پر ''جی حضور'' کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ یتھا سادھیہ (اپنی عزت کے لیے) کسی معاملے۔ مقدمے میں نہ پڑتے تھے، چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ کام سولہوں آنے مختاروں کے ہاتھ میں تھا، وے ایک کے سو کریں یا سو کا ایک۔ فارسی اور عربی کے عالم تھے شرع کے بڑے پابند، سود کو حرام سمجھتے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے، تیسوں روزے رکھتے اور نتیہ (روز) قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ مگر دھارمک سنکیرتا (مذہبی کوتاہ نظری) کہیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ پراتہ کال گنگا اسنان کرنا ان کا نتیہ (روز) کا نیم (اصول) تھا۔ پانی برسے، پالا پڑے، پر پانچ بجے وہ کوس بھر چل کر گنگا تٹ پر اوشیہ پہنچ جاتے۔ لوٹتے وقت اپنی چاندی کی صراحی گنگا جل سے بھر لیتے اور ہمیشہ گنگا جل پیتے۔ گنگا جل کے سوا وہ اور کوئی پانی پیتے ہی نہ تھے۔ شاید کوئی یوگی یتی بھی گنگا جل پر اتنی شردھا (عقیدت) نہ رکھتا ہوگا۔ ان کا سارا گھر بھیتر سے باہر تک، ساتویں دن گئو کے گوبر سے لیپا جاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں، ان کے یہاں باغیچے میں ایک پنڈت بارہوں ماس درگا پاٹھ کیا کرتے تھے۔ سادھو سنیاسیوں کا آدرستکار (عزت و احترام) تو ان کے یہاں جتنی ادارتا (فیاضی اور بھگتی سے کیا جاتا تھا اس پر راجوں کو بھی آشچریہ (تعجب) ہوتا تھا۔ یوں کہیے کہ سدا ورت چلتا۔ ادھر مسلمان فقیروں کا کھانا باورچی خانے میں پکتا تھا اور کوئی سو سوا سو آدمی نت ایک دسترخوان پر کھاتے تھے۔ اتنا دان پنیہ کرنے پر بھی ان پر کسی مہاجن کا ایک کوڑی کا بھی

قرض نہ تھا۔ نیت کی کچھ ایسی برکت تھی کہ دن دن انتی (ترقی) ہی ہوتی تھی۔ ان کی ریاست میں عام حکم تھا کہ مردوں کو جلانے کے لیے کسی یگیہ یا بھوج کے لیے، شادی بیاہ کے لیے سرکاری جنگل سے جتنی لکڑی چاہے کاٹ لو۔ چودھری صاحب سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہندو آسامیوں کی بارات میں ان کی اُور سے کوئی نہ کوئی ضرور شریک ہوتا تھا۔ نیوتے کے روپے بندھے ہوئے تھے، لڑکیوں کے وواہ میں کنیا دان کے روپے مقرر تھے، ان کو ہاتھی، گھوڑے، تنبو، شامیانے، پالکی نالکی، فرش جازیمیں، پنکھے چنور، چاندی کے مخملی سامان ان کے یہاں سے بنا کسی دقت کے مل جاتے تھے، مانگنے بھر کی دیر رہتی تھی۔ اس دانی، اُدار، یشوی (نیک) آدمی کے لیے پرجا بھی پران دینے کو تیار رہتی تھی۔

(۲)

چودھری صاحب کے پاس ایک راجپوت چپراسی تھا بھجن سنگھ۔ پورے چھ فٹ کا جوان تھا، چوڑا سینہ، بانے کا لٹھیت، سیکڑوں کے بیچ سے مار کر نکل آنے والا۔ اسے بھئے تو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ چودھری صاحب کو اس پر اسیم (بے حد) وشواس (یقین) تھا، یہاں تک کہ حج کرنے گئے تو اسے بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے دشمنوں کی کمی نہ تھی، آس پاس کے سبھی زمیندار ان کی شکتی اور کیرتی سے جلتے تھے۔ چودھری صاحب کے خوف کے مارے وے اپنے آسامیوں پر من مانا اتیاچار نہ کر سکتے تھے، کیوں کہ وہ نربلوں (کمزوروں) کا پکش (اورا) لینے کے لیے سدا تیار رہتے تھے۔ لیکن بھجن سنگھ ساتھ ہو، تو انھیں دشمن کے دوار پر بھی سونے میں کوئی شنکا نہ تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دشمنوں نے انھیں گھیر لیا اور بھجن سنگھ اکیلا جان پر کھیل کر انھیں بے داغ نکال لایا۔ ایسا آگ میں کود پڑنے والا آدمی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو جب تک خیریت سے گھر نہ پہنچ جائے، چودھری صاحب کو شنکا بنی رہتی کہ کہیں کسی سے لڑ نہ بیٹھا ہو۔ بس پالتو میڈے کی سی دشا تھی، جو زنجیر سے چھوٹتے ہی کسی نہ کسی سے ٹکر لینے دوڑتا ہے۔ تینوں لوک میں چودھری صاحب کے سوا اس کی نگاہوں میں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ بادشاہ کہو، مالک کہو، دیوتا کہو، جو کچھ تھے چودھری صاحب تھے۔

مسلمان لوگ چودھری صاحب سے جلا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے دین سے پھر گئے ہیں ایسا وچتر جیون سدھانت (زندگی کا عجیب نظریہ) ان کی سمجھ میں کیوں کر آتا۔ مسلمان، اگر سچا مسلمان ہے تو گنگا جل کیوں پیے، سادھوؤں کا آدر ستکار کیوں کرے، درگا پاٹھ کیوں کروائے؟ ملاؤں میں ان کے خلاف ہنڈیاں پکتی رہتی تھیں اور ہندوؤں کو زک دینے کی تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آخر یہ رائے طے پائی کہ ٹھیک جنم اشٹمی کے دن ٹھاکردوارے پر حملہ کیا جائے اور ہندوؤں کا

سر نیچا کردیا جائے، دکھا دیا جائے کہ چودھری صاحب کے بل پر پھولے پھولے پھرنا تمھاری بھول ہے۔ چودھری صاحب کہہ ہی کیا لیں گے۔ اگر انھوں نے ہندوؤں کی حمایت کی تو ان کی خبر لی جائے گی، سارا ہندو پن نکل جائے گا۔

(۳)

اندھیری رات تھی، کڑے کے بڑے ٹھاکر دوارے میں کرشن کا جنم اتسو منایا جارہا تھا۔ ایک ورِدھ مہاتما پوپلے منہ سے تنبورے پر دھرپد الاپ رہے تھے اور بھکت جن ڈھول مجیرے لیے بیٹھے تھے کہ ان کا گانا بند ہو، تو ہم اپنا کیرتن شروع کریں۔ بھنڈاری پرساد بنا رہا تھا۔ سینکڑوں آدمی تماشا دیکھنے کے لیے جمع تھے۔

سہسا مسلمانوں کا ایک دل لاٹھیاں لیے ہوئے آپہنچا، اور مندر پر پتھر برسانا شروع کیے۔ شور مچ گیا۔ پتھر کہاں سے آتے ہیں! یہ پتھر کون پھینک رہا ہے۔ کچھ لوگ مندر کے باہر نکل کر دیکھنے لگے۔ مسلمان لوگ تو گھات میں بیٹھے ہی تھے، لاٹھیاں جمانی شروع کیں۔ ہندوؤں کے ہاتھ میں اس سمے ڈھول مجیرے کے سوا اور کیا تھا۔ کوئی مندر میں آچھپا، کوئی کسی دوسری طرف بھاگا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔

چودھری صاحب کو بھی خبر ہوئی۔ بھجن سنگھ سے بولے۔ ٹھاکر، دیکھو تو کیسا شور وغل ہے؟ جاکر بدمعاشوں کو سمجھا دو اور نہ مانیں تو دو چار ہاتھ چلا بھی دینا، مگر خون خچر نہ ہونے پائے۔

ٹھاکر یہ شور وغل سن سن کر دانت پیس رہے تھے، دل پہ پتھر کی سل رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ آدیش (حکم) سنا تو منہ مانگی مراد پائی۔ شترو بھجن ڈنڈا کندھے پر رکھا اور لپکے ہوئے مندر پہنچے۔ وہاں مسلمانوں نے گھور اپدرو (فساد) مچا رکھا تھا۔ کئی آدمیوں کا پیچھا کرتے ہوئے مندر میں گھس گئے تھے اور شیشے کے سامان توڑ پھوڑ رہے تھے۔

ٹھاکر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، سر پر خون سوار ہوگیا۔ لاکارتے ہوئے مندر میں گھس گیا اور بدمعاشوں کو پیٹنا شروع کیا۔ ایک طرف تو وہ اکیلا اور دوسری طرف پچاسوں آدمی! لیکن واہ رے شیر! اکیلے سب کے چھکے چھڑا دیے، کئی آدمیوں کو مار گرایا۔ غصے میں اسے اس وقت کچھ نہ سوجھتا تھا کسی کے مرنے جینے کی پروا نہ تھی۔ معلوم نہیں، اس میں اتنی شکتی کہاں سے آگئی تھی۔ اسے ایسا جان پڑتا تھا کہ کوئی دیوی شکتی میری مدد کر رہی ہے۔ کرشن بھگوان سویم اس کی رکشا کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دھرم سنگرام میں منشیوں سے آلوکک کام ہو جاتے ہیں۔

ادھر ٹھاکر کے چلے آنے کے بعد چودھری صاحب کو بھے ہوا کہ کہیں ٹھاکر کسی کا خون نہ کر ڈالے،

اس کے پیچھے خود بھی مندر میں آپہنچے۔ دیکھا تو کہرام مچا ہوا ہے۔ بدمعاش لوگ اپنی جان لے لے کر بے تحاشہ بھاگے جا رہے ہیں، کوئی پڑا کراہ رہا ہے، کوئی ہائے ہائے کر رہا ہے۔ ٹھاکر کو پکارنا ہی چاہتے تھے کہ سہسا ایک آدمی بھاگا ہوا آیا اور ان کے سامنے آتا آتا زمین پر گر پڑا۔ چودھری صاحب نے اسے پہچان لیا اور دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیری ہوگئی۔ یہ ان کا اکلوتا داماد اور ان کی جائیداد کا وارث شاہد حسین تھا!

چودھری نے دوڑ کر شاہد کو سنبھالا اور زور سے بولے۔ ٹھاکر، ادھر آؤ۔ لالٹین ...... لالٹین! آہ یہ تو میرا شاہد ہے!

ٹھاکر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لالٹین لے کر باہر نکلے۔ شاہد حسین ہی تھے۔ ان کا سر کٹ گیا تھا اور رکت اچھلتا ہوا نکل رہا تھا۔

چودھری نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ ٹھاکر، تم نے میرا چراغ ہی گل کر دیا۔

ٹھاکر نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ مالک، بھگوان جانتے ہیں، میں نے پہچانا نہیں۔

چودھری۔ نہیں، میں تمھارے اوپر الزام نہیں رکھتا۔ بھگوان کے مندر میں کسی کو گھسنے کا اختیار نہیں ہے۔ افسوس یہی ہے کہ خاندان کا نشان مٹ گیا اور تمھارے ہاتھوں! تم نے میرے لیے ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھی، اور خدا نے تمھارے ہی ہاتھوں میرا ستیاناش کرا دیا۔

چودھری صاحب روتے جاتے تھے اور یہ باتیں کہتے جاتے تھے۔ ٹھاکر گلانی اور پشچا تاپ (ندامت) سے گڑا جاتا تھا۔ اگر اس کا اپنا لڑکا مارا گیا ہوتا، تو اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ آہ! میرے ہاتھوں میرے مالک کا سروناش ہوا! جس کے پسینے کی جگہ وہ خون بہانے کو تیار رہتا تھا، جو اس کا سوامی ہی نہیں اشٹ تھا، جس کے ذرا سے اشارے پر وہ آگ میں کود سکتا تھا، اسی کے ونش کی اس نے جڑ کاٹ دی! وہ اس کی آستین کا سانپ نکلا! روندھے ہوئے کنٹھ سے بولا۔ سرکار، مجھ سے بڑھ کر ابھاگا اور کون ہوگا۔ میرے منہ میں کالک لگ گئی۔

یہ کہتے کہتے ٹھاکر نے کمر سے چھرا نکال لیا۔ وہ اپنی چھاتی میں چھرا گھونپ کر کالیما کو رکت سے دھونا چاہتے تھے کہ چودھری صاحب نے لپک کر چھرا ان کے ہاتھوں سے چھین لیا اور بولے۔ کیا کرتے ہو ہوش سنبھالو۔ یہ تقدیر کے کرشمے ہیں۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ میں اگر خود شیطان کے بہکانے میں آکر مندر میں گھستا اور دیوتا کی توہین کرتا اور تم مجھے پہچان کر بھی قتل کر دیتے، تو میں اپنا خون معاف کر دیتا۔ کسی کے دین کی توہین کرنے سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں ہے۔ گو اس وقت میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے اور یہ صدمہ میری جان ہی لے کر چھوڑے گا، پر خدا گواہ ہے

کہ مجھے تم سے ذرا بھی ملال نہیں ہے۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا، چاہے میرے مالک کا بیٹا ہی کیوں نہ ہوتا۔ گھر والے مجھے طعنوں سے چھیدیں گے، لڑکی رو رو کر مجھ سے خون کا بدلہ مانگے گی، سارے مسلمان میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے، میں کافر اور بے دین کہا جاؤں گا، شاید کوئی دین کا پکا نوجوان مجھے قتل کرنے پر بھی تیار ہو جائے، لیکن میں حق سے منہ نہ موڑوں گا۔ اندھیری رات ہے، اسی دم یہاں سے بھاگ جاؤ اور میرے علاقے کی کسی چھاونی میں چھپ جاؤ۔ وہ دیکھو، کئی مسلمان چلے آرہے ہیں۔ میرے گھر والے ابھی ہیں۔ بھاگو بھاگو!

(۴)

سال بھر بھجن سنگھ چودھری صاحب کے علاقے میں چھپا رہا۔ ایک اُور مسلمان لوگ اس کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ دوسری اُور پولیس۔ لیکن چودھری اسے ہمیشہ چھپاتے رہتے تھے۔ اپنے سماج کے طعنے سہے، اپنے گھر والوں کا ترسکار (لعنتیں) سہا، پولیس کے وار سہے، ملاؤں کی دھمکیاں سہیں، پر بھجن سنگھ کی خبر کسی کے کانوں کان نہ ہونے دی۔ ایسے وفادار سوامی بھگت سیوک کو وہ جیتے جی نردے قانون کے پنجے میں نہ دینا چاہتے تھے۔ ان کے علاقے کی چھاونیوں میں کئی بار تلاشیاں ہوئیں۔ ملاؤں نے گھر کے نوکروں، ماماؤں، لونڈیوں کو ملایا۔ لیکن چودھری نے ٹھاکر کو اپنے احسانوں کی بھانتی چھپائے رکھا۔

لیکن ٹھاکر کو اپنے پرانوں کی رکھشا کے لیے چودھری صاحب کو سنکٹ میں پڑے دیکھ کر اسہائے ویدنا (ناقابل برداشت تکلیف) ہوتی تھی۔ اس کے جی میں بار بار آتا تھا، چل کر مالک سے کہہ دوں۔ مجھے پولیس کے حوالے کر دیجیے۔ لیکن چودھری صاحب بار بار اسے چھپے رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔

جاڑوں کے دن تھے، چودھری صاحب اپنے علاقے کا دورہ کر رہے تھے اب وہ مکان پر بہت کم رہتے تھے۔ گھر والوں کے شبد بانوں سے بچنے کا یہی اُپائے تھا۔ رات کو کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے کہ بھجن سنگھ آکر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ چودھری صاحب دیکھ کر چونک پڑے۔ ٹھاکر نے کہا۔ سرکار اچھی طرح ہیں۔

چودھری۔ ہاں، خدا کا فضل ہے۔ تم تو بالکل پہچانے ہی نہیں جاتے۔ اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟

ٹھاکر۔ مالک، اب تو چھپ کر نہیں رہا جاتا۔ حکم ہو تو جا کر عدالت میں حاضر ہو جاؤں۔ جو بھاگیہ میں لکھا ہوگا، وہ ہوگا۔ میرے کارن آپ کو اتنی حیرانی ہو رہی ہے، یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

چودھری۔ نہیں، ٹھاکر، میرے جیتے جی نہیں۔ تمھیں جان بوجھ کر بھاڑ کے منہ میں نہیں ڈال سکتا۔ پولیس اپنی مرضی کے موافق شہادتیں بنائے گی اور مفت میں تمھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ تم نے میرے لیے بڑے بڑے خطرے سہے ہیں۔ اگر میں تمھارے لیے اتنا بھی نہ کرسکوں، تو مجھ سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا؟ اس بارے میں اب پھر مجھ سے کچھ مت کہنا۔

ٹھاکر۔ کہیں کسی نے سرکار..........

چودھری۔ اس کا بالکل غم نہ کرو۔ جب تک خدا کو منظور نہ ہوگا، کوئی میرا بال بھی بانکا نہیں کرسکتا۔ تم اب جاؤ۔ یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔

ٹھاکر۔ سنتا ہوں، لوگوں نے آپ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

چودھری۔ دشمنوں کا دور رہنا ہی اچھا۔

لیکن ٹھاکر کے دل میں جو بات جم گئی تھی، وہ نہ نکلی۔ اس ملاقات نے اس کا ارادہ اور بھی پکا کر دیا۔ انھیں میرے کارن یوں مارے مارے پھرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں ان کا کون اپنا بیٹھا ہوا ہے؟ جو چاہے آکر حملہ کرسکتا ہے۔ میری اس زندگی کو دھتکار!

پراتہ کال ٹھاکر ضلع حاکم کے بنگلے پر پہنچا۔ صاحب نے پوچھا۔ تم اب تک چودھری کے کہنے سے چھپا تھا؟

ٹھاکر۔ نہیں، ہجور اپنی جان کے خوف سے۔

(۵)

چودھری صاحب نے یہ خبر سنی، تو سناٹے میں آگئے۔ اب کیا ہو؟ اگر مقدمہ کی پیروی نہ کی گئی تو ٹھاکر کا بچنا مشکل ہے۔ پیروی کرتے ہیں، تو اسلامی دنیا میں تہلکا پڑ جاتا ہے۔ چاروں طرف سے فتوے نکلنے لگیں گے۔ ادھر مسلمانوں نے ٹھان لی کہ اسے پھانسی دلا کر ہی چھوڑیں گے۔ آپس میں چندے کی اپیل کی، دوار دوار جھولی باندھ کر گھومے۔ اس پر قومی مقدمے کا رنگ چڑھایا گیا مسلمان وکیلوں کو نام لوٹنے کا موقع ملا۔ آس پاس کے ضلعوں سے جہاد میں شریک ہونے کے لیے آنے لگے۔

چودھری صاحب نے بھی پیروی کرنے کا نشچے کیا، چاہے کتنی آفتیں کیوں نہ سر پر آپڑیں۔ ٹھاکر انھیں انصاف کی نگاہ میں بے قصور معلوم ہوتا تھا اور بے قصور کی رکشا کرنے میں انھیں کسی کا خوف

نہ تھا۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور شہر میں جا کر ڈیرا جما دیا۔

چھ مہینے تک چودھری صاحب نے جان لڑا کر مقدمے کی پیروی کی۔ پانی کی طرح روپے بہائے، آندھی کی طرح دوڑے۔ وہ سب کیا جو زندگی میں کبھی نہ کیا تھا، اور نہ پیچھے کبھی کیا۔ اہلکاروں کی خوشامدیں کیں۔ وکیلوں کے ناز اُٹھائے، حاکموں کو نظریں دیں اور ٹھاکر کو چھڑا لیا۔ سارے علاقے میں دھوم مچ گئی۔ جس نے سنا، دنگ رہ گیا۔ اسے کہتے ہیں شرافت! اپنے نوکر کو پھانسی سے اُتار لیا۔

لیکن سامپردائک دویش (فرقہ وارانہ حسد) نے اسی ست کاریہ (حق پرستی کے کام) کو اور ہی آنکھوں سے دیکھا۔ مسلمان جھلائے، ہندوؤں نے بغلیں بجائیں۔ مسلمان سمجھے، ان کی رہی سہی مسلمانی بھی غائب ہوگئی۔ ہندوؤں نے خیال کیا اب ان کی شُدھی کر لینی چاہیے۔ ملاؤں نے اور زور شور سے تبلیغ کی ہانک لگانی شروع کی، ہندوؤں نے بھی سنگھٹن کا جھنڈا اُٹھایا۔ مسلمانوں کی مسلمانی جاگ اُٹھی اور ہندوؤں کا ہندوتو۔ ٹھاکر کے قدم بھی اس ریلے میں اُکھڑ گئے۔ منچلے تھے ہی، ہندوؤں کے مکھیا بن بیٹھے۔ زندگی میں کبھی ایک لوٹا جل تک شیو کو نہ چڑھایا تھا، اب دیوی دیوتاؤں کے نام پر لٹھ چلانے کے لیے اُدھت ہو گئے۔ شدھی کرنے کو کوئی مسلمان نہ ملا، تو دو ایک چماروں ہی کی شدھی کرا ڈالی۔ چودھری صاحب کے دوسرے نوکروں پر بھی اثر پڑا، جو مسلمان کبھی مسجد کے سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے، وے پانچوں وقت کی نماز ادا کرنے لگے، جو ہندو کبھی مندروں میں جھانکتے بھی نہ تھے، وے دونوں وقت سندھیا کرنے لگے۔

بستی میں ہندوؤں کی سنکھیا ادھک تھی۔ اس پر ٹھاکر بھجن سنگھ بنے ان کے مکھیا، جن کی لاٹھی کا لوہا سب مانتے تھے۔ پہلے مسلمان سنکھیا میں کم ہونے پر بھی، ان پر غالب رہتے تھے، کیوں کہ وے سنگھٹت (منظم) نہ تھے، لیکن اب وے سنگھٹت ہو گئے تھے، بھلا مٹھی بھر مسلمان ان کے سامنے کیا ٹھہرتے۔

ایک سال اور گزر گیا۔ پھر جنم اشٹمی کا اتسو آیا۔ ہندوؤں کو ابھی تک ہار بھولی نہ تھی۔ گپت روپ سے برابر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آج پراتہ کال ہی سے بھکت لوگ مندر میں جمع ہونے لگے۔ سب کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، کتنے ہی آدمیوں نے کمر میں چھرے چھپا لیے تھے۔ چھیڑ کر لڑنے کی رائے پکی ہو گئی تھی۔ پہلے کبھی اس اتسو میں جلوس نہ نکلا تھا۔ آج دھوم دھام سے جلوس بھی نکلنے کی ٹھہری۔

دیپک جل چکے تھے۔ مسجدوں میں شام کی نماز ہونے لگی تھی۔ جلوس نکلا۔ ہاتھی گھوڑے، جھنڈے جھنڈیاں، باجے گاجے، سب ساتھ تھے۔ آگے آگے بھجن سنگھ اپنے اکھاڑے کے پٹھوں کو لیے اکڑتے چلے جاتے تھے۔

جامع مسجد سامنے دکھائی دی۔ پٹھوں نے لاٹھیاں سنبھالیں، سب لوگ سترک (مستعد) ہو گئے۔

جو لوگ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، آ کر سمٹ گئے۔ آپس میں کچھ کانا پھوسی ہوئی۔ باجے اور زور سے بجنے لگے۔ جے جے کار کی دھونی اور زور سے اُٹھنے لگی۔ جلوس مسجد کے سامنے آ پہنچا۔

سہسا ایک مسلمان نے مسجد سے نکل کر کہا۔ نماز کا وقت ہے، باجے بند کر دو۔

بھجن سنگھ۔ باجے نا بند ہوں گے۔

مسلمان۔ بند کرنے پڑیں گے۔

بھجن سنگھ۔ تم اپنی نماز کیوں نہیں بند کر دیتے؟

مسلمان۔ چودھری صاحب کے بل پر مت پھولنا۔ اب کے ہوش ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

بھجن سنگھ۔ چودھری صاحب کے بل پر تم پھولو، یہاں اپنے ہی بل کا بھروسا ہے۔ یہ دھرم کا معاملہ ہے۔

اتنے میں کچھ اور مسلمان نکل آئے، اور باجے بند کرنے کا آگرہ کرنے لگے، اودھر اور زور سے باجے بجنے لگے۔ بات بڑھ گئی۔ ایک مولوی نے بھجن سنگھ کو کافر کہہ دیا۔ ٹھاکر نے اس کی داڑھی پکڑ لی۔ پھر کیا تھا۔ سورما لوگ نکل پڑے، مار پیٹ شروع ہو گئی۔ ٹھاکر بلا مار کر مسجد میں گھس گئے، اور مسجد کے اندر مار پیٹ ہونے لگی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔ ہندو کہتے تھے، ہم نے کھدیڑ کھدیڑ کر مارا، مسلمان کہتے تھے، ہم نے وہ مار ماری کہ پھر سامنے نہیں آئیں گے۔ پر ان وادوں (بحث و تکرار) کے بیچ ایک بات سب مانتے تھے اور وہ تھی ٹھاکر بھجن سنگھ کی آلو کک ویرتا۔ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ ٹھاکر نہ ہوتا تو ہم کسی کو زندہ نہ چھوڑتے، ہندو کہتے تھے کہ ٹھاکر سچ مچ مہاویر کا اوتار ہے۔ اس کی لاٹھیوں نے ان سبھوں کے چھکے چھڑا دیے۔

اَتسو سماپت ہو چکا تھا۔ چودھری صاحب دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ ان کا مکھ لال تھا، تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ ''خدا کا گھر'' ناپاک کیا گیا! یہ خیال رہ رہ کر ان کے کلیجے کو مسوستا تھا۔

خدا کا گھر ناپاک کیا گیا! ظالموں کو لڑنے کے لیے کیا نیچے میدان میں جگہ کافی نہ تھی! خدا کے پاک گھر میں یہ خون خچر! مسجد کی یہ بے حرمتی! مندر بھی خدا کا گھر ہے اور مسجد بھی۔ مسلمان کسی مندر کو ناپاک کرنے کے لیے جس سزا کے لائق ہیں، کیا ہندو مسجد کو ناپاک کرنے کے لیے اسی سزا کے لائق نہیں؟ اور یہ حرکت ٹھاکر نے کی! اسی قصور کے لیے تو اس نے میرے داماد کو قتل کیا تھا مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے ہاتھوں ایسا فعل ہوگا، تو اسے پھانسی پر چڑھنے دیتا۔ کیوں اس کے لیے اتنا حیران، اتنا بدنام، اتنا زیر بار ہوتا۔ ٹھاکر میرا وفادار نوکر ہے۔ اس نے بارہا میری جان بچائی۔

میرے پسینے کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتا ہے۔ لیکن آج اس نے خدا کے گھر کو ناپاک کیا ہے اور اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اس کی سزا کیا ہے؟ جہنم کی آگ کے سوا اس کی اور کوئی سزا نہیں ہے۔ جس نے خدا کے گھر کو ناپاک کیا، اس نے خدا کی توہین کی۔ خدا کی توہین!

سہما ٹھاکر بھجن سنگھ آکر کھڑے ہو گئے۔

چودھری صاحب نے ٹھاکر کو کرودھومت (غصہ اگلتی ہوئی) آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ تم مسجد میں گھسے تھے؟

بھجن سنگھ۔ سرکار، مولوی لوگ ہم لوگوں پر ٹوٹ پڑے۔

چودھری۔ میری بات کا جواب دو جی۔ تم مسجد میں گھسے تھے؟

بھجن سنگھ۔ جب ان لوگوں نے مسجد کے بھیتر سے ہمارے اوپر پتھر پھینکنا شروع کیا تب ہم لوگ انھیں پکڑنے کے لیے مسجد میں گھس گئے۔

چودھری۔ جانتے ہو، مسجد خدا کا گھر ہے؟

بھجن سنگھ۔ جانتا ہوں حجور، کیا اتنا بھی نہیں جانتا۔

چودھری۔ مسجد خدا کا ویسا ہی پاک گھر ہے، جیسے مندر۔

بھجن سنگھ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔

چودھری۔ اگر کوئی مسلمان مندر کو ناپاک کرنے کے لیے گردن زدنی ہے تو ہندو بھی مسجد کو ناپاک کرنے کے لیے گردن زدنی ہے۔

بھجن سنگھ اس کا بھی کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس نے چودھری صاحب کو کبھی اتنے غصے میں نہ دیکھا تھا۔

چودھری۔ تم نے میرے داماد کو قتل کیا، اور میں نے تمھاری پیروی کی۔ جانتے ہو کیوں؟ اسی لیے کہ میں اپنے داماد کو اس سزا کا لائق سمجھتا تھا جو تم نے اسے دی۔ اگر تم نے میرے بیٹے کو، یا مجھی کو اس قصور کے لیے مار ڈالا ہوتا تو میں تم سے خون کا بدلہ نہ مانگتا۔ وہ قصور آج تم نے کیا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے مسجد میں تمھیں جہنم میں پہنچا دیا ہوتا تو مجھے سچی خوشی ہوتی لیکن تم بے حیاؤں کی طرح وہاں سے بچ کر نکل آئے۔ کیا تم سمجھتے ہو خدا تمھیں اس فعل کی سزا نہ دے گا؟ خدا کا حکم ہے کہ جو اس کی توہین کرے، اس کی گردن ماردینی چاہیے۔ یہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ چور اگر سزا نہ پاوے تو کیا وہ چور نہیں ہے؟ تم مانتے ہو یا نہیں کہ تم نے خدا کی توہین کی ہے؟

ٹھاکر اس اپرادھ سے انکار نہ کر سکے۔ چودھری صاحب کے ست سنگ نے ہٹھ دھرمی کو دور کر دیا

تھا۔ بولے۔ ہاں صاحب یہ قصور تو ہو گیا۔

چودھری۔ اس کی جو سزا تم دے چکے ہو، وہ سزا خود لینے کے لیے تیار رہو؟

ٹھاکر۔ میں نے جان بوجھ کر تو دولھا میاں کو نہیں مارا تھا۔

چودھری۔ تم نے نہ مارا ہوتا، تو میں اپنے ہاتھوں سے مارتا، سمجھ گئے۔ اب میں تم سے خدا کی توہین کا بدلہ لوں گا۔ بولو میرے ہاتھوں چاہتے ہو یا عدالت کے ہاتھوں۔ عدالت سے کچھ دنوں کے لیے سزا پاؤ گے۔ میں قتل کر دوں گا۔ تم میرے دوست ہو، مجھے تم سے مطلق کینہ نہیں ہے۔ میرے دل کو کتنا رنج ہے، یہ خدا کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن میں تمہیں قتل کروں گا۔ میرے دین کا یہ حکم ہے۔

یہ کہتے ہوئے چودھری صاحب تلوار لے کر ٹھاکر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وچتر درشیہ تھا۔ ایک بوڑھا آدمی، سر کے بال پکے، کمر جھکی، تلوار لیے ایک دیو کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹھاکر لاٹھی کے ایک ہی وار سے ان کا کام تمام کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے سر جھکا دیا۔ چودھری کے پرتی اس کے روم روم میں شردھا تھی۔ چودھری صاحب اپنے دین کے اتنے پکے ہیں؟ اس کی اس نے کبھی کلپنا (تصور) تک نہ کی تھی۔ اسے شاید دھوکا ہو گیا تھا کہ یہ دل سے ہندو ہے۔ جس سوامی نے اسے پھانسی سے اُتار لیا، اسی کے پرتی ہنسا (تشدد) یا پرتی کار کا بھاؤ اس کے من میں کیوں کر آتا؟ وہ دلیر تھا، اور دلیروں کی بھانتی نشکپٹ تھا۔ اسے اس سمے کرودھ نہ تھا، پشچا تاپ تھا۔ مرنے کا بھے نہ تھا، دُکھ تھا۔

چودھری صاحب ٹھاکر کے سامنے کھڑے تھے۔ دین کہتا تھا۔ مارو۔ سجنتا کہتی تھی۔ چھوڑو۔ دین اور دھرم میں سنگھرش (کشمکش) ہو رہا تھا۔

ٹھاکر نے چودھری کا تجسس دیکھا۔ گدگد کنٹھ سے بولا۔ مالک آپ کی دیا مجھ پر ہاتھ نہ اُٹھانے دی گی۔ اپنے پالے ہوئے سیوک کو آپ مار نہیں سکتے۔ لیکن یہ سر آپ کا ہے۔ آپ نے اسے بچایا تھا، آپ اسے لے سکتے ہیں، یہ میرے پاس آپ کی امانت تھی۔ وہ امانت آپ کو مل جائے گی۔ سویرے میرے گھر کسی کو بھیج کر منگوا لیجیے گا۔ یہاں دوں گا، تو اپدرو کھڑا ہو جائے گا۔ گھر پر کون جانے گا، کس نے مارا۔ جو بھول چوک ہوئی ہو چھما کیجیے گا۔

یہ کہتا ہوا ٹھاکر وہاں سے چلا گیا۔

(یہ افسانہ ماہ نامہ مادھوری اپریل ۱۹۲۵ء کے شمارے میں شائع 'گپت دھن نمبر۲' میں شامل ہے۔ یہاں رسم خط بدل کر اردو میں شائع کیا جا رہا ہے)۔

جلوس

(۱)

کانگریس کا جلوس نکل رہا تھا۔ کچھ نوجوان، کچھ بوڑھے، کچھ بچے جھنڈیاں اور جھنڈے لیے ''بندے ماترم'' گاتے ہوئے مال کے سامنے سے نکلے۔ دونوں طرف تماشائیوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ گویا ان کو اس جتھے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ کوئی تماشا ہے اور ان کا کام صرف کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا ہے۔

شمبھوناتھ نے دکان کی پٹری پر کھڑے ہو کر اپنے ہمسایہ دین دیال سے کہا۔ ''سب کے سب موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ آگے سواروں کا دستہ مار مار کر بھگا دے گا۔''

دین دیال نے کہا۔ ''مہاتما جی بھی سٹھیا گئے ہیں۔ جلوس سے سوراجیہ مل جاتا تو اب تک کب کا مل گیا ہوتا۔ اور جلوس میں ہیں کون لوگ دیکھا! لونڈے!! لفنگے!!! دیوانے!!! شہر کا کوئی بڑا آدمی نہیں۔''

میکو جو چپلوں اور سلیپروں کی مالا گردن میں لٹکائے کھڑا تھا ان دونوں سیٹھوں کی باتیں سن کر ہنس پڑا۔ شمبھو نے پوچھا۔ ''کیوں ہنسے میکو؟''

آج رنگ گہرا معلوم ہوتا ہے۔

میکو: ہنسا اس بات پر جو تم نے کہی کہ بڑا آدمی جلوس میں نہیں ہے۔ بڑے آدمی جلوس میں کیوں آنے لگے۔ انھیں اس راج میں کون آرام نہیں ہے۔ بنگلوں اور محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹروں پر گھومتے ہیں۔ صاحبوں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ انھیں کون تکلیف ہے۔ مرتو ہم لوگ رہے ہیں جنھیں روٹیوں کا ٹھکانہ نہیں۔ اس وقت کوئی ٹینس کھیلتا ہوگا۔ کوئی چائے پیتا ہوگا۔ کوئی گراموفون لیے گانا سنتا ہوگا۔ کوئی پارک کی سیر کرتا ہوگا۔ یہاں آویں پولس کے کوڑے کھانے کے

لیے تم نے بھی اچھی کہی۔

شمبھو: تم یہ باتیں کیا سمجھو گے میکو! جس کام تیں چار بڑے آدمی شامل ہوتے ہیں اس کی سرکار پر بھی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ لونڈے لفنگوں کو حاکم لوگ بھلا کیا سمجھتے ہیں۔

میکو نے ایسی نگاہ سے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ ''ان باتوں کو ہم بھی سمجھتے ہیں۔'' اور بولا بڑے آدمیوں کو ہمیں لوگ بناتے بگاڑتے ہیں۔ یا کوئی اور؟ کتنے ہی لوگ جنھیں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ہمارے بنائے بڑے آدمی بن گئے اور اب موٹروں پر نکلتے ہیں اور ہمیں نیچا سمجھتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی تکدیر کی کھوبی ہے کہ جس کی جرا بھی تر کی ہوئی بس اس نے ہم لوگوں کی طرف سے نگاہ بدلی۔ ہمارا بڑا آدمی تو وہی ہے جو لنگوٹی باندھے ننگے پاؤں گھومتا ہے۔ جو ہمارے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ ہمیں اور کسی بڑے آدمی کی پرواہ نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو ان بڑے آدمیوں نے ہی ہماری مٹی خراب کر رکھی ہے۔ انھیں سرکار نے کوئی اچھی سی جگہ دے دی۔ بس اس کا دم بھرنے لگے۔

دین دیال: نیا داروغہ بڑا اجلاد ہے۔ چوراہے پر پہنچتے ہی ہنٹر لے کر پل پڑے گا۔ پھر دیکھنا سب کیسا دم دبا کر بھاگتے ہیں۔ مزا آوے گا۔

جلوس آزادی کے نشے میں چور چوراہے پر پہنچا تو دیکھا کہ سواروں اور سپاہیوں کا ایک دستہ راستہ روکے کھڑا ہے۔

یکایک داروغہ بیربل سنگھ گھوڑا بڑھا کر جلوس کے سامنے آ گئے اور بولے۔ ''تم لوگوں کو آگے جانے کا حکم نہیں۔'' جلوس کے بڈھے لیڈر ابراہیم علی نے آگے بڑھ کر کہا: ''میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ کسی قسم کا دنگا فساد نہ ہوگا۔ ہم دکانیں لوٹنے یا موٹریں توڑنے نہیں نکلے ہیں۔ ہمارا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔

بیربل سنگھ: مجھے یہ حکم ہے کہ جلوس یہاں سے آگے نہ جانے پاوے۔

ابراہیم: آپ اپنے افسروں سے ذرا پوچھ لیں۔

بیربل سنگھ: میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔

ابراہیم: تو ہم لوگ یہیں بیٹھے ہیں۔ جب آپ لوگ چلے جائیں تو ہم نکل جائیں گے۔

بیربل سنگھ: یہاں کھڑے ہونے کا بھی حکم نہیں ہے۔ تم کو واپس جانا پڑے گا۔

ابراہیم نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ''واپس تو ہم نہ جائیں گے۔ آپ کو یا کسی کو بھی ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ اپنے سواروں، سنگینوں اور بندوقوں کے زور سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں۔ روک لیجیے۔ مگر آپ ہمیں واپس نہیں کر سکتے۔''

بیربل سنیرک تھا۔ اس کا باپ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اس کی رگ رگ میں رعب بھرا ہوا تھا۔ افسروں کی نگاہ میں اس کی بڑی عزت تھی۔ خاصا گورا چٹا، نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا صاحب اقبال شخص تھا۔ شاید جس وقت وہ کوٹ پہن کر اوپر سے ہیٹ لگا لیتا تو وہ بھول جاتا تھا کہ میں بھی یہیں کا رہنے والا ہوں۔ غالباً وہ اپنے کو حکومت کرنے والی قوم کا جز سمجھنے لگا تھا۔ مگر ابراہیم علی کے مردانہ استقلال نے ذرا دیر کے لیے اس کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ جلوس کو راستہ دے دیتا ہے تو جواب طلب ہو جائے گا۔ وہیں کھڑا رہنے دیتا ہے تو یہ سب نہ جانے کب تک کھڑے رہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو موٹر پر آتے دیکھا۔ اب پس و پیش کا وقت نہ تھا۔ یہی موقع تھا کارگذاری دکھانے کا اس نے کمر سے بیٹن نکال لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جلوس پر چڑھانے لگا۔ اسے دیکھتے ہی اور سواروں نے بھی گھوڑوں کو جلوس پر چڑھانا شروع کر دیا۔ ابراہیم داروغہ کے گھوڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ایک بیٹن ایسے زور سے پڑا کہ اس کی آنکھیں تلملا گئیں۔ کھڑا نہ رہ سکا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت داروغہ کے گھوڑے نے دونوں پاؤں اٹھائے اور زمین پر بیٹھا ہوا ابراہیم اس کے ٹاپوں کے نیچے آ گیا۔ جلوس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ ابراہیم کو گرتے دیکھ کر کئی آدمی اسے اُٹھانے کے لیے لپکے مگر کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ ادھر سواروں کے ڈنڈے بڑی بے رحمی سے پڑ رہے تھے۔ لوگ ہاتھوں پر ڈنڈوں کو روکتے تھے اور ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دل سے اشتعال کو دور رکھنا ان کے لیے دم بہ دم مشکل ہوتا جاتا تھا۔ مگر مسلک اور اصول نے ان کے جذبات اور حرکات کو بندشوں سے جکڑ رکھا تھا۔

دس بارہ منٹ تک یونہی ڈنڈوں کی بوچھار ہوتی رہی اور لوگ خاموش کھڑے رہے۔

(۲)

اس مار پیٹ کی خبر ایک ہی آن میں بازار میں جا پہنچی۔ ابراہیم گھوڑے سے کچل گئے۔ کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ کتنوں ہی کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ مگر نہ وہ لوگ واپس ہوتے ہیں نہ پولیس انھیں آگے جانے دیتی ہے۔

میکو نے جوش میں آ کر کہا۔ ''اب تو بھائی یہاں نہیں رہا جاتا۔ میں بھی چلتا ہوں۔''

دین دیال نے کہا۔ ''ہم بھی چلتے ہیں بھائی! دیکھی جائے گی۔''

شمبھو ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ یکا یک اس نے بھی دکان بڑھائی اور بولا۔ ''ایک دن تو مرنا ہی ہے جی، جو کچھ ہونا ہے ہو۔ آخر یہ لوگ سبھی کے لیے تو جان دے رہے ہیں۔'' دیکھتے دیکھتے زیادہ تر دکانیں بند ہو گئیں۔ وہ لوگ جو دس منٹ پیشتر تماشا دیکھ رہے تھے۔ ادھر ادھر سے دوڑ پڑے اور ہزاروں آدمیوں کا ایک جم غفیر جائے وقوع کی طرف چلا۔ یہ متوالا گروہ خونریزی کے نشے میں بھرے ہوئے آدمیوں کا گروہ تھا، جسے اصول اور مسلک کی پرواہ نہ تھی۔ جو مرنے کے لیے ہی نہیں مارنے کے لیے بھی تیار تھے۔ کتنوں ہی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ کتنے ہی جیبوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کسی سے کچھ بولتا تھا نہ پوچھتا تھا۔ بس سب کے سب دل میں ایک مستقل ارادہ کیے لپکے چلے جا رہے تھے۔ گویا کوئی گھٹا امڈی چلی آتی ہو۔

اس گروہ کو دور سے دیکھتے ہی سواروں میں کچھ ہلچل پڑی۔ بیربل سنگھ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اپنی موٹر آگے بڑھائی۔

امن اور عدم تشدد کے حامیوں پر ڈنڈے برسانا اور بات تھی۔ لیکن ایک پر جوش گروہ سے مقابلہ کرنا دوسری بات۔ سوار اور سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔

ابراہیم کی پیٹھ پر گھوڑے نے ٹاپ رکھ دیا تھا۔ وہ بے ہوش زمین پر پڑے تھے۔ ان آدمیوں کو اشارہ سے بلا کر کہا۔ کیوں کیلاش! کیا کچھ لوگ شہر سے آرہے ہیں۔

کیلاش نے اس بڑھتی ہوئی گھٹا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جی ہاں ہزاروں آدمی ہیں۔''

ابراہیم: تو اب خیریت نہیں ہے۔ جھنڈا لوٹا دو۔ ہمیں: فوراً واپس چلنا چاہیے۔ نہیں تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ ہمیں اپنے بھائیوں سے لڑائی نہیں کرنا ہے۔ فوراً واپس چلو۔

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اٹھ نہ سکے۔

اشارے کی دیر تھی۔ منظم فوج کی طرح لوگ حکم پاتے ہی پیچھے پھر گئے۔

جھنڈیوں کے بانسوں، صافوں اور رومالوں سے فوراً ایک اسٹریچر تیار ہو گیا۔ ابراہیم کو لوگوں نے اس پر لٹا دیا اور واپس ہوئے۔ مگر کیا وہ مغلوب ہو گئے تھے؟ اگر کچھ لوگوں کو انھیں مغلوب سمجھنے میں ہی تسلی ہوتی ہو، تو ہو۔ لیکن حقیقت میں انھوں نے ایک معرکتہ الآرا فتح حاصل کی تھی۔ وہ جانتے تھے ہماری کشمکش اپنے ہی بھائیوں سے ہے۔ جن کے مفاد حالتِ موجودہ میں ہمارے مفاد سے

علاحدہ ہیں۔ ہمیں ان سے دشمنی نہیں کرنی ہے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں لوٹ مار اور فتنہ وفساد کا بازار گرم ہو جائے اور ہماری قومی جدوجہد کا نتیجہ لٹی ہوئی دکانیں اور ٹوٹے ہوئے سر ہوں۔ ان کی فتح کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ انھوں نے پبلک کی ہمدردی حاصل کرلی تھی۔ وہی لوگ جو پہلے اُن پر تمسخر کرتے تھے۔ ان کا استقلال اور ان کی جرأت دیکھ کر ان کی امداد کے لیے نکل پڑے تھے۔ ذہنیت کی یہ تبدیلی، یہ بے داری ہی ان کی اصلی فتح تھی۔

تین دن گزر گئے تھے۔ بیر بل سنگھ اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور ان کی بیوی مٹھن بائی بچے کو گود میں لیے سامنے کھڑی تھیں۔

بیر بل سنگھ نے کہا۔ میں اس وقت کیا کرتا؟ پیچھے ڈی۔ ایس۔ پی کھڑا تھا۔ اگر جلوس کو راستہ دے دیتا تو اپنی جان مصیبت میں پھنستی۔

مٹھن بائی نے سر ہلا کر کہا۔ تم کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ ان پر ڈنڈے نہ چلاتے۔ کیا تمھارا کام آدمیوں پر ڈنڈے چلانا ہے؟ تم زیادہ سے زیادہ جلوس کو روک سکتے تھے۔ کل کو تمھیں مجرموں کو بید لگانے کا کام دیا جائے تو شاید تمھیں بڑی خوشی ہوگی۔ کیوں؟

بیر بل سنگھ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ تم تو بات نہیں سمجھتی ہو!

مٹھن بائی: میں خوب سمجھتی ہوں۔ ڈی۔ ایس۔ پی پیچھے کھڑا تھا۔ تم نے خیال کیا ہوگا کہ کارگزاری دکھانے کا ایسا موقع پھر کبھی ملے یا نہ ملے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس گروہ میں کوئی بھلا آدمی نہ تھا؟ اس میں کتنے ہی آدمی ایسے تھے جو تمھارے جیسوں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔ علم میں تو شاید زیادہ تر تم سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ مگر تم ان پر ڈنڈے چلا رہے تھے۔ اور انھیں گھوڑے سے کچل رہے تھے۔ واہ ری جواں مردی!

بیر بل سنگھ نے بے حیائی کی ہنسی کے ساتھ کہا۔ صاحب نے میرا نام نوٹ کرلیا ہے۔ سچ!

داروغہ نے سمجھا تھا۔ یہ مژدۂ جاں فزا سنا کر وہ مٹھن بائی کو خوش کرلیں گے۔ شرافت اور اخلاق کی چشم نمائیاں اس نفع صریح کی تاب نہ لا سکیں گی۔ مگر مٹھن بائی کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ بولی۔ ضرور کرلیا ہوگا۔ اور شاید تمھیں جلد ترقی بھی مل جائے۔ مگر بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر ترقی پائی تو کیا پائی۔ یہ تمھاری کارگزاری کا انعام نہیں۔ تمھاری غداری کی قیمت ہے۔ تمھاری کارگذاری کا انعام تو اس وقت ملے گا جب تم کسی خونی کو کھوج نکالو گے۔ کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچا لو گے۔

یکا یک ایک سپاہی نے برآمدہ میں کھڑے ہو کر کہا۔ ''حضور! یہ لفافہ لایا ہوں۔'' بیربل سنگھ نے باہر نکل کر لفافہ لے لیا اور اندر کی سرکاری چٹھی نکال کر پڑھنے لگے پڑھ کر اسے میز پر رکھ دیا۔

مٹھن نے پوچھا۔ کیا ترقی کا پروانہ آگیا؟

بیربل سنگھ نے جھینپ کر کہا۔ تم تو بناتی ہو۔ آج پھر کوئی جلوس نکلنے والا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ رہنے کا حکم ہوا ہے۔

مٹھن: پھر تو تمھاری چاندی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ آج پھر ویسے ہی شکار ملیں گے۔ خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ دکھانا، ڈی۔ ایس۔ پی ضرور آئیں گے اس مرتبہ تم انسپکٹر ہو جاؤ گے سچ۔!

بیربل سنگھ نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ فرض کرو میں جا کر خاموش کھڑا رہوں تو کیا نتیجہ ہوگا؟ میں نالائق سمجھا جاؤں گا اور میری جگہ کوئی دوسرا آدمی بھیج دیا جائے گا۔ کہیں شبہ ہو گیا کہ مجھے سوراجیوں سے ہمدردی ہے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر برخاست نہ بھی ہوا تو لین کی حاضری تو ہو ہی جائے گی۔ آدمی جس دنیا میں رہتا ہے اسی کا چلن دیکھ کر کام کرتا ہے۔ میں عقل مند نہ سہی پر اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ ملک اور قوم کو آزاد کرانے کے لیے ہی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ سرکار اس خیال کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ ایسا گدھا نہیں ہوں کہ غلامی کی زندگی پر فخر کروں۔ لیکن حالت موجودہ سے مجبور ہوں۔

باجے کی آواز کانوں میں آئی۔ بیربل سنگھ نے باہر جا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا سوراجیوں کا جلوس آرہا ہے۔ فوراً وردی پہنی۔ صافہ باندھا اور جیب میں پستول رکھ کر باہر آئے۔ دم بھر میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ کانسٹبل پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ سب لوگ ڈبل مارچ کرتے ہوئے جلوس کی طرف روانہ ہوئے۔

(۴)

یہ لوگ کوئی پندرہ منٹ میں جلوس کے سامنے پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بے شمار گلوں سے ''بندے ماترم'' کی ایک آواز نکلی گویا بادلوں میں گرج ہوئی ہو۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ اس جلوس میں کسی قدر فرق تھا۔ وہ سوراجیہ کے جشن کا جلوس تھا۔ یہ ایک شہید کے ماتم کا۔ تین دن کے مسلسل بخار اور تکلیف کے بعد آج اس زندگی کا خاتمہ ہو گیا، جس نے کبھی عہدے کی خواہش نہیں کی۔ کبھی منصب کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انھوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔ میری لاش کو گنگا میں غسل دے کر دفن کیا جائے اور میرے مزار پر سوراجیہ کا جھنڈا نصب کیا جائے۔ ان کے انتقال کی خبر

پھیلتے ہی سارے شہر پر ماتم کا پردہ سا پڑ گیا۔ جو سنتا تھا ایک مرتبہ اس طرح چونک پڑتا تھا گویا کہ اسے گولی سی لگ گئی ہو اور فوراً ان کی زیارت کے لیے بھاگتا تھا۔ سارے بازار بند ہو گئے یکے اور تانگوں کا بھی کہیں پتہ نہ تھا جیسے شہر لُٹ گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر امنڈ پڑا۔ جس وقت جنازہ اُٹھا۔ لاکھ سوا لاکھ آدمی۔ساتھ تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے سرخ نہ ہو۔

بیربل سنگھ اپنے کانسٹبلوں اور سواروں کو پانچ پانچ گز کے فاصلہ پر جلوس کے ساتھ چلنے کا حکم دے کر خود پیچھے چلے گئے۔ پچھلی صفوں میں کوئی پچاس گز مستورات تھیں۔ داروغہ نے ان کی طرف دیکھا۔ پہلی ہی قطار میں مٹھن بائی نظر آئی۔ بیربل کو اعتبار نہ آیا۔ پھر غور کر کے دیکھا وہی تھی۔ مٹھن نے ان کی طرف ایک بار دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ لیکن اس کی ایک چتون میں کچھ ایسی لعنت، کچھ ایسی شرم، کچھ ایسا درد اور کچھ ایسی نفرت بھری ہوئی تھی کہ بیربل سنگھ کے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اپنی نگاہ میں کبھی ایسے ہلکے، اتنے کمزور اور اتنے ذلیل نہ ہوئے تھے۔

یکا یک ایک عورت نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ کوتوال صاحب! کہیں ہم لوگوں پر ڈنڈے نہ چلا دیجیے گا۔ آپ کو دیکھ کر ڈر ہو رہا ہے۔

دوسری بولی۔ آپ ہی کے تو کوئی بھائی تھے۔ جنھوں نے اس دن نال کے چوراہہ پر ڈنڈوں کی بارش کی تھی۔

مٹھن نے کہا۔ ''آپ کے کوئی بھی نہ تھے۔ آپ خود تھے۔''

بیسوں منہ سے آوازیں نکلیں۔ اچھا! یہ وہی صاحب ہیں۔!! صاحب۔ آپ کو آداب ہے! یہ آپ ہی کی نوازش کا نتیجہ ہے کہ آج ہم بھی آپ کے ڈنڈے کی زیارت کے لیے آ کھڑی ہوئی ہیں۔

بیربل نے مٹھن بائی کی طرف آنکھوں کا بھالا چلایا۔ پر منہ سے کچھ نہ بولے۔ ایک تیسری خاتون نے پھر کہا۔ ہم ایک جلسہ کر کے آپ کو ہار پہنائیں گے۔ ایک بڑھیا نے آنکھیں چڑھا کر کہا۔ ''میری کوکھ سے ایسا بچہ پیدا ہوتا تو اس کی گردن مروڑ دیتی۔''

ایک نوجوان خاتون نے اس کی سرزنش کر کے کہا۔ ''آپ بھی خوب کہتی ہیں۔ ماتا جی! کتے تک تو نمک کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ تو آدمی ہیں۔''

بڑھیا نے جھلا کر کہا۔ ''آدمی نہیں! پیٹ کے غلام...... ہائے پیٹ! پیٹ!!

اس پر کئی عورتوں نے بڑھیا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور وہ بے چاری شرمندہ ہو کر بولی۔ ''ارے تو میں

کچھ کہتی تھوڑے ہی ہوں۔ مگر ایسا آدمی بھی کیا جو خود غرضی کے پیچھے اندھا ہو جائے۔"

بیر بل سنگھ اب اور نہ سن سکے۔ گھوڑا بڑھا کر جلوس سے کئی گز پیچھے چلے گئے۔ مرد طعنے دے تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ عورت طعنے دیتی ہے تو ہم خفیف ہو جاتے ہیں۔ بیر بل سنگھ کی اس وقت اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر ان خاتونوں کے سامنے جاتے۔ اپنے افسروں پر غصہ آیا۔ مجھ کو ہی بار بار کیوں ان کاموں پر تعینات کیا جاتا ہے اور لوگ بھی تو ہیں۔ انھیں کیوں نہیں بلایا جاتا۔ کیا میں ہی سب سے گیا گذرا ہوں؟ کیا میں ہی سب سے بے حس ہوں؟ مٹھی اس وقت مجھے دل میں کس قدر بزدل اور ذلیل سمجھ رہی ہوں گی۔ شاید اس وقت مجھے کوئی مار بھی ڈالے تو وہ زبان نہ کھولے گی۔ غالباً دل ہی دل میں خوش بھی ہوگی کہ اچھا ہوا۔ ابھی کوئی جا کر صاحب سے کہہ دے کہ بیر بل سنگھ کی بیوی جلوس میں نکلی تھی تو کہیں کا نہ رہوں۔ مٹھی جانتی ہے۔ سمجھتی ہے۔ پھر بھی نکل کھڑی ہوئی۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ کوئی فکر نہیں ہے نہ، جبھی تو یہ باتیں سوجھتی ہیں۔ یہاں سبھی بے فکرے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے لڑکے، مزدور، پیشہ ور، انھیں کیا فکر۔ موت تو ہم لوگوں کی ہے جن کے بال بچے ہیں اور کچھ عزت کا خیال ہے۔ سب کی سب میری طرف کیسا گھور رہی ہیں گویا کھا جائیں گی۔

جلوس شہر کی خاص سڑکوں سے گزرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دونوں طرف چھتوں، چھجوں، جنگلوں اور درختوں پر تماشائیوں کی دیواریں سی کھڑی تھیں۔ بیر بل سنگھ کو آج ان کے چہروں پر ایک نئی امنگ، ایک نیا عزم اور ایک نئی شان جھلکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ امنگ بڈھوں کے چہروں پر، عزم نوجوانوں کے، اور شان خاتونوں کے۔ ان کے سفر کی منزل مقصود مفقود نہ تھی۔ گم گشتوں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنا نہ تھا۔ پامالوں کی طرح سر جھکا کر رونا نہ تھا۔ آزادی کی سنہری چوٹی دور دراز آسمان پر چمک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو درمیان کے نالوں اور جنگلوں کی پرواہ نہیں ہے۔ سب اس سنہری منزل پر پہنچنے کے شوق میں بے چین ہو رہے ہیں۔

گیارہ بجتے بجتے جلوس دریا کے کنارے جا پہنچا۔ جنازہ اتارا گیا اور لوگ لاش کو گنگا اشنان کرانے کے لیے چلے۔ اس کی سرد، خاموش اور زرد پیشانی پر لاٹھی کی چوٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ خون جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ سر کے بڑے بڑے بال خون جم جانے سے کسی مصور کے برش کی طرح چمٹ گئے تھے۔ کئی ہزار آدمی اس شہید کی آخری زیارت کے لیے حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بیر بل سنگھ پیچھے گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ لاٹھی کی چوٹ انھیں بھی نظر آئی۔ ان کی روح نے انھیں پُر زور ملامت کی۔ وہ لاش کی طرف نہ دیکھ سکے۔ منہ پھیر لیا۔ جس شخص کی زیارت کے لیے جس کی

خاک پا کو پیشانی پر لگانے کے لیے لاکھوں آدمی بے تاب ہو رہے ہیں، اس کی میں نے اتنی بے عزتی کی۔ ان کی روح اس وقت اعتراف کر رہی تھی کہ اس بے رحمانہ تشدد میں فرض کی ادائیگی کا شمہ بھی نہ تھا۔ صرف خود غرضی تھی۔ کارگذاری دکھانے کا جوش اور افسروں کو خوش کرنے کی تمنا۔ ہزاروں آنکھیں غصہ سے بھری ہوئی اُن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

ایک کانسٹبل نے آکر تعریف کی۔ حضور کا ہاتھ گہرا پڑا تھا۔ ابھی تک کھوپڑی کھلی ہوئی ہے۔

بیربل نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ میں اسے اپنی جواں مردی نہیں، اپنا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔

کانسٹبل نے پھر خوشامد کی۔ بڑا سرکش آدمی تھا، حضور!

بیربل نے غصہ کے ساتھ کہا۔ چپ رہو۔ جانتے بھی ہو سرکش کسے کہتے ہیں۔

سرکش وہ کہلاتے ہیں جو ڈاکے مارتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں۔ خون کرتے ہیں۔ انھیں سرکش نہیں کہتے جو ملک کی بہبودی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے گھومتے ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ جن کی مدد کرنی چاہیے، ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ گھمنڈ کرنے اور خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ شرم کرنے اور رونے کی بات ہے۔

غسل ختم ہوا۔ جلوس یہاں سے پھر روانہ ہوا۔

(۵)

لاش کو جب خاک کے نیچے سلا کر لوگ واپس ہوئے تو دو بج رہے تھے۔ مٹھن بائی عورتوں کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک آئی۔ پر کوئنس پارک میں آکر ٹھٹک گئی۔ گھر جانے کی خواہش نہ ہوئی۔ وہ بڑھا، زخمی، خون آلودہ چہرہ گویا اس کے دل میں بیٹھا محبت کی بندشوں کو کاٹ رہا تھا۔ شوہر سے اس کا دل اس قدر پھر گیا تھا کہ اب اسے ملامت کرنے کی بھی اس کی خواہش نہ تھی ایسے خود غرض آدمی پر خوف کے علاوہ اور کسی چیز کا اثر ہو سکتا ہے۔ اس کا اسے یقین ہی نہ تھا۔

وہ بڑی دیر تک پارک میں گھاس پر بیٹھی سوچتی رہی۔ لیکن اپنے طرزِ عمل کا بھی فیصلہ قطعی نہ کر سکی۔ میکے جا سکتی تھی لیکن وہاں سے مہینہ دو مہینہ میں پھر اسی گھر میں آنا پڑے گا۔ نہیں، میں کسی کی محتاج نہ بنوں گی۔ کیا میں اپنے گزر بسر کو بھی نہیں کما سکتی؟ اس نے خود طرح طرح کی مشکلات کا خیال کیا۔ لیکن آج اس کے دل میں نہیں معلوم اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ ان فرضی باتوں کا خیال کرنا

ہی اسے اپنی کمزوری معلوم ہوئی۔

یکا یک اسے ابراہیم علی کی بوڑھی بیوہ کا خیال آیا۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے لڑکے بالے نہیں ہیں۔ بیچاری اکیلی بیٹھی رو رہی ہوگی۔ کوئی تسلی دینے والا بھی پاس نہ ہوگا۔ وہ ان کے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔ پتا اُس نے پہلے ہی اپنے ساتھ کی عورتوں سے دریافت کرلیا تھا...... وہ دل میں سوچتی جاتی تھی۔ میں ان سے کیسے ملوں گی؟ ان سے کیا کہوں گی۔ انھیں کن لفظوں میں سمجھاؤں گی۔ انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ ابراہیم علی کے گھر پر پہنچ گئی۔ مکان ایک گلی میں تھا۔ صاف ستھرا لیکن دروازہ پر حسرت برس رہی تھی۔ اس نے دھڑ کتے ہوئے دل سے اندر قدم رکھا۔ سامنے برآمدہ میں ایک چارپائی پر وہ بوڑھی بیوہ بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے شوہر نے آج آزادی کی لڑائی میں اپنی قربانی دی تھی، اس کے سامنے سادے کپڑے پہنے ایک نوجوان کھڑا آنکھوں میں آنسو بھرے بوڑھی سے کچھ باتیں کررہا تھا۔ متھن اس نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ بیربل سنگھ تھے۔

اس نے غصہ میں بھرے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ تم یہاں کیسے آئے؟ بیربل سنگھ نے کہا۔ اسی طرح جیسے تم آئیں۔ اپنی خطا معاف کرانے آیا ہوں۔

متھن بائی کے گورے چہرہ پر آج فخر، مسرت اور محبت کی پاکیزہ شگفتگی نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کی ساری مرادیں پوری ہوگئی ہیں اور اس سے زیادہ نصیبہ ور عورت دنیا میں نہیں۔

مگر اس نے اپنی خوشی کو سرد مہری کے پردہ میں چھپا کر سخت لہجہ میں کہا۔ دنیا میں بعض ایسی خطائیں ہیں جن کی معافی ممکن نہیں۔ زبان خلق کی عدالت تمھیں کبھی معاف نہیں کرسکتی۔

بیربل نے ایک بار اس کی طرف پُر سوال نظروں سے دیکھ کر کہا ''تم ٹھیک کہتی ہو متھی۔''

اس نے فوراً جیب سے پستول نکالا اور اپنے سینہ میں گولی مار لی۔ بوڑھی بیوہ چیخ کر اسے سنبھالنے دوڑی مگر متھن بائی اسی شگفتہ انداز سے کھڑی تھی۔

(یہ قصہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے مارچ ۱۹۳۰ کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مانسرووَر نمبر ۷ میں شامل ہے۔ اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔)

پُوس کی رات!

(۱)

ہلکو نے آکر اپنی بیوی سے کہا۔ ''شہنا آیا ہے لاؤ جو روپے رکھے ہیں اسے دے دو۔ کسی طرح گردن تو چھوٹے۔''

منی بہو جھاڑو لگا رہی تھی۔ پیچھے پھر کر بولی ''تین ہی تو روپے ہیں دے دو تو کمبل کہاں سے آئے گا۔ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔ اس سے کہہ دو فصل پر روپے دے دیں گے۔ ابھی نہیں ہے۔''

ہلکو تھوڑی دیر تک چپ کھڑا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا پوس سر پر آ گیا بغیر کمبل کے کھیت میں رات کو وہ کسی طرح سو نہیں سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں، گھڑکیاں دے گا۔ گالیاں سنائے گا۔ بلا سے جاڑوں میں مریں گے۔ یہ بلا تو سر سے ٹل جائے گی۔ یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا اپنی بیوی کے پاس گیا۔ اور خوشامد کر کے بولا۔ ''لا دے دے گردن تو کسی طرح سے بچے کمبل کے لیے کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔

منی اس کے پاس سے دور ہٹ گئی اور آنکھیں ٹیڑھی کرتی بولی۔ ''کر چکے دوسری تدبیر۔ ذرا سنوں کون تدبیر کرو گے؟ کون کمبل خیرات میں دے دے گا۔ نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام کرو۔ پیداوار ہو تو اس سے قرضہ ادا کرو۔ چلو چھٹی ہوئی قرضہ ادا کرنے کے لیے تو ہم پیدا ہی ہوئے ہیں۔ ایسی کھیتی سے باز آئے۔ میں روپے نہ دوں گی نہ دوں گی۔''

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا۔ ''تو کیا گالیاں کھاؤں۔''

منی نے کہا۔ ''گالیاں کیوں دے گا؟ کیا اس کا راج ہے؟ مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ہلکو کی بات میں جو دل ہلا دینے والی صداقت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے طاق پر سے روپے اُٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر بولی تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی۔

کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھی کھیتی ہے۔ مزدوری کر کے لاؤ وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس۔''

ہلکو نے روپے لیے اور اس طرح باہر چلا کہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپے کمبل کے لیے جمع کیے تھے۔ وہ آج نکلے جا رہے ہیں۔ ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔

(۲)

پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کے پتوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتا ''جبرا'' پیٹ میں منہ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔ دو میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا۔'' کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے کہا تو تھا۔ گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اب کھا سردی میں کیا کروں۔ جانتا تھا میں حلوہ پوری کھانے آ رہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے آگے چلے آئے۔ اب روؤ اپنے نانی کے نام کو''جبرا نے لیٹے ہوئے دُم ہلائی اور ایک انگڑائی لے کر چپ ہو گیا۔ شاید وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کوں، کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آ رہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔'' کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے۔ یہ رانڈ پچھوا ہوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آ رہی ہے۔ اٹھوں پھر ایک چلم بھروں۔ کسی طرح رات تو کٹے۔ آٹھ چلم تو پی چکا۔ یہ کھیتی کا مزہ ہے اور ایک بھاگوان ایسے ہیں جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے گدے، لحاف، کمبل، مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے۔ تقدیر کی خوبی ہے۔ مزدوری ہم کریں۔ مزہ دوسرے لوٹیں۔''

ہلکو اُٹھا اور گڈھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری جبرا بھی اٹھ بیٹھا۔ ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا۔ پئے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے۔ ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔

جبرا نے اس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہلکو نے کہا۔'' آج اور جاڑا کھا لے۔ کل سے میں یہاں پیال بچھا دوں گا۔ اس میں گھس کر بیٹھنا جاڑا نہ لگے گا۔

جبرا نے اگلے پنجے اس کی گھٹنیوں پر رکھ دیے اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی۔ چلم پی کر ہلکو پھر لیٹا اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو اب کی سو جاؤں گا۔ لیکن

ایک لمحہ میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کبھی اس کروٹ لیٹا کبھی اس کروٹ۔ جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔ جب کسی طرح نہ رہا گیا۔ تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اُٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی۔ پر اُسے اپنی گود سے چمٹاتے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ بہشت یہی ہے اور ہلکو کی روح اتنی پاک تھی کہ اس کو کتے سے بالکل نفرت نہ تھی وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اس کی روح کے سب دروازے کھول دیے تھے اور اس کا ایک ایک ذرہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔
اسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ پائی۔ اس کے مالک کی اس خاص روحانیت نے اس کے دل میں ایک جدید طاقت پیدا کر دی تھی جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ناچیز سمجھ رہی تھی۔ وہ چھپٹ کر اُٹھا اور چھپری سے باہر آ کر بھونکنے لگا۔ ہلکو نے اسے کئی مرتبہ پچکار کر بلایا پر وہ اس کے پاس نہ آیا۔ کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا۔ فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

(۳)

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اُٹھ بیٹھا اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپا لیا۔ پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ اس نے اُٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا ابھی کتنی رات باقی ہے۔ وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر چکے۔ جب وہ اوپر آ جائیں گے تو کہیں سویرا ہوگا۔ ابھی ایک گھڑی سے زیادہ رات باقی ہے۔
ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک باغ تھا۔ پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہلکو نے سوچا چل کر پتیاں بٹوروں اور ان کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی مجھے پتیاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے کہ کوئی بھوت ہے۔ کون جانے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو۔ مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔
اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر کئی پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سلگتا ہوا اپلہ لیے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اسے جاتے دیکھا تو پاس آیا اور دم ہلانے لگا۔
ہلکو نے کہا۔ اب تو نہیں رہا جاتا۔ جبرو، چلو باغ میں پتیاں بٹور کر تاپیں تاٹھے ہو جائیں گے تو پھر آ کر سوئیں گے۔ ابھی تو رات بہت ہے۔

جبرا نے کوں۔کوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے موافقت ظاہر کی اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں۔ یکا یک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا کیسی اچھی مہک آئی جبرا۔ تمھاری ناک میں بھی کچھ خوشبو آ رہی ہے؟

جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی۔ وہ اسے چوس رہا تھا۔ ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرتے جاتے تھے۔ ننگے پاؤں گلے جاتے تھے اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اُٹھا۔ اس کی لو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی۔ اس متزلزل روشنی میں باغ کے عالی شان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے کہ وہ اس لا انتہا اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں یہ روشنی ایک ناؤ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبالی اور دونوں پاؤں پھیلا دیے۔ گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا۔ ''تیرے جی میں جو آئے وہ کر۔'' سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا۔

اس نے جبرا سے کہا۔ کیوں جبرؔ! اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے؟

جبرا نے کوں، کوں، کر کے گویا کہا۔ اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی۔؟

''پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی، نہیں تو اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے؟

جبرا نے دُم ہلائی۔

اچھا آؤ، اس الاؤ کو کود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے۔ اگر جل گئے بچہ تو میں دوا نہ کروں گا۔''

جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی جانب دیکھا۔

''منی سے کل یہ نہ جڑ دینا کہ رات خوب ٹھنڈ لگی۔ اور تاپ تاپ کر رات کاٹی ورنہ لڑائی کرے گی۔''

یہ کہتا ہوا وہ اچھلا اور اس الاؤ کے اوپر سے صاف نکل گیا۔ پیروں میں ذرا سی لپٹ لگ گئی۔ پر وہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

ہلکو نے کہا۔ چلو چلو۔ اس کی سہی نہیں۔ اوپر سے کود کر آؤ۔

وہ پھر کودا اور الاؤ کے اس پار آ گیا۔

پتیاں جل چکی تھیں۔ باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے کچھ کچھ آگ باقی تھی۔ جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اُٹھتی تھی۔ پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی۔ اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا ایک گیت گنگنانے لگا۔ اس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی۔ پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی اس سستی کو دبائے لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہوا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے کھیت میں آیا۔ شاید نیل گایوں کا جھنڈ تھا۔ ان کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف کان میں آ رہی تھیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ وہ کھیت میں چر رہی ہیں...... اس نے دل میں کہا۔ نہیں جبرا کے ہوتے کوئی جانور کھیت میں نہیں آ سکتا۔ نوچ ہی ڈالے۔ مجھے وہم ہو رہا ہے۔ کہاں! اب تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کیسا دھوکا ہوا۔

اس نے زور سے آواز لگائی۔ جبرا۔ جبرا۔

جبرا بھونکتا رہا۔ اس کے پاس نہ آیا۔

جانوروں کے چرنے کی آواز چر، چر، سنائی دینے لگی۔ ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا۔ مگر اسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایا ہوا مزے سے بیٹھا تھا۔ اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا جانوروں کو بھگانا، ان کا تعاقب کرنا اسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لیے چلاّنے لگا لہولہو، ہو۔ ہو۔ ہاہا۔

مگر جبرا پھر بھونک اُٹھا۔ اگر جانور بھاگ جاتے تو وہ اب تک لوٹ آیا ہوتا۔ نہیں بھاگے۔ ابھی تک چر رہے ہیں۔ شاید وہ سب بھی سمجھ رہے ہیں کہ اس سردی میں کون بیدھا ہے جو ان کے پیچھے دوڑے گا۔ فصل تیار ہے۔ کیسی اچھی کھیتی تھی۔ سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر جلتا تھا۔ اسے یہ ابھاگے تباہ کیے ڈالتے ہیں۔

اب ہلکو سے نہ رہا گیا۔ وہ پکا ارادہ کر کے اُٹھا اور دو تین قدم چلا۔ پھر یکا یک ہوا کا ایسا ٹھنڈا، چبھنے والا، بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا کہ وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا۔ نیل گائیں کھیت کا صفایا کیے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس بے حس بیٹھا ہوا تھا۔ افسردگی نے اسے چاروں طرف سے رسی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ آخر وہی چادر اوڑھ کر سو گیا۔ سویرے جب اس کی نیند کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی ہے اور منی کھڑی

کہہ رہی ہے۔ کیا آج سوتے ہی رہو گے۔ تم یہاں میٹھی نیند سو رہے ہو اور ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔ سارا کھیت ستیاناس ہو گیا۔ بھلا کوئی ایسا بھی سوتا ہے تمھارے یہاں منڈیا ڈالنے سے کیا ہوا۔

ہلکو نے بات بنائی میں مرتے مرتے بچا، تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے۔ پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈ پر آئے۔ دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں اور جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے۔ گویا بدن میں جان ہی نہیں ہے۔

دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منی کے چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی، پر ہلکو خاموش تھا۔

منی نے فکر مند ہو کر کہا۔ اب مجوری کر کے مال گجاری دینی پڑے گی۔

ہلکو نے مستانہ انداز سے کہا۔ رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔ میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں۔ مرنے کے لیے نہیں کرتے۔

جبرا ابھی تک سویا ہوا ہے۔ اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا۔''

آج جا کر شحنہ سے کہہ دے، کھیت جانور چر گئے۔ ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔

''رات بڑے غضب کی سردی تھی۔''

''میں کیا کہتی ہوں۔ تم کیا سنتے ہو۔''

''تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ شحنہ کو ان باتوں سے کیا سروکار۔

تمھارا کھیت چاہے جانور کھائیں، چاہے آگ لگ جائے، چاہے اولے پڑ جائیں۔ اسے تو اپنی مالگجاری چاہیے۔

''تو چھوڑ دو کھیتی۔ میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔''

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں منی! تجھ سے سچ کہتا ہوں۔ مگر مجوری کا خیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا۔ چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے کھیتی کا مرجادنہ بگاڑوں گا۔ جبرا۔ جبرا! کیا سوتا ہی رہے گا۔ چل گھر چلیں۔

(یہ افسانہ لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے مئی ۱۹۳۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرو ور نمبر-۱ میں شامل ہے اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔)

نجات

(۱)

دکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا اور اس کی بیوی جھریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے تو چمارن نے کہا:

''تو جا کر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں۔''

دکھی: ہاں جاتا ہوں لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟

جھریا: کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی، ٹھکرانی سے مانگ لانا۔

دکھی: تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے؟ جا کر ایک لوٹا پانی مانگوں تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دے گا۔ ہمارے اوپلے، ایندھن، بھوسا لکڑی تھوڑے ہی ہیں کہ جو چاہے اُٹھا لے جائے۔ اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے۔ گرمی کے تو دن ہیں ان کے آتے آتے سوکھ جائے گی۔

جھریا: ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھیں گے، دیکھتے نہیں کتنے نیم دھرم سے رہتے ہیں۔

دکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا۔ ''ہاں یہ بات تو ہے مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتّل بنا لوں تو ٹھیک ہو جائے۔ پتّل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں۔ وہ پاک ہے۔ لا تو لاٹھی پتے توڑ لوں۔''

جھریا: پتّل میں بنا لوں گی۔ تم جاؤ لیکن ہاں انھیں سیدھا بھی جائے اور تھالی بھی۔ چھوٹے بابا تھالی اُٹھا کر پٹک دیں گے۔ وہ بہت جلد غصہ میں آ جاتے ہیں۔ غصہ میں پنڈتانی تک کو نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لیے پھرتا ہے۔ پتّل میں سیدھا بھی دے دینا مگر چھونا مت۔ بھوری گونڈ کی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھرپور۔ سیر بھر آٹا، آدھ سیر چاول، پاؤ بھر دال، آدھ پاؤ گھی، نمک، ہلدی اور پتّل میں ایک کنارے چار آنہ کے

پیسے رکھ دینا۔ گونڈ کی لڑکی نہ ملے تو پھر جن کے ہاتھ پیر جوڑ کر لے آنا۔ تم کچھ نہ چھونا ورنہ گجب ہو جائے گا۔

ان باتوں کی تاکید کر کے دکھی نے لکڑی اُٹھالی اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کے لیے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اسے خالی دیکھ کر تو باباجی دور ہی سے دھتکار دیتے۔

(۲)

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشوراپاسنا میں لگ جاتے۔ منہ ہاتھ دھوتے آٹھ بجتے تب اصلی پوجا شروع ہوتی۔ جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے۔ پھر آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے۔ چندن کے متوازی خطوں کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ ہوتا۔ پھر سینہ پر دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے اور ٹھاکر جی کی مورتی نکال کر اسے نہلاتے۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے، آرتی کرتے اور گھنٹی بجاتے۔ دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اُٹھتے اور بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اس وقت دو چار ججمان دروازے پر آجاتے۔ ایشوراپاسنا کا فی الفور پھل مل جاتا۔ یہی ان کی کھیتی تھی۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے تو دیکھا، دکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لیے بیٹھا ہے۔ انھیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا پُر جلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پُر ہو گیا۔ کتنی تقدس مآب صورت تھی۔ چھوٹا سا گول مول آدمی۔ چکنا سر، پھولے ہوئے رخسار، روحانی جلال سے منور آنکھیں اس پر روئی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدیس عطا کر دی تھی۔ دکھی کو دیکھ کر شیریں لہجہ میں بولے۔ ''آج کیسے چلا آیا رے دکھیا۔؟''

دکھی نے سر جھکا کر کہا۔ ''بٹیا کی سگائی کر رہا ہوں مہاراج! ساعت شگن بچارنا ہے۔ کب مرجی ہوگی۔؟''

گھاسی: آج تو مجھے چھٹی نہیں ہے۔ شام تک آجاؤں گا۔

دکھی: نہیں مہاراج! جلدی مرجی ہو جائے۔ سب سامان ٹھیک کر آیا ہوں۔ یہ گھاس کہاں رکھ دوں؟

گھاسی: اس گائے کے سامنے ڈال دے اور ذرا جھاڑو لے کر دروازہ تو صاف کر دے۔ یہ

بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ دے۔ تب تک میں بھوجن کرلوں۔ پھر ذرا آرام کر کے چلوں گا۔ ہاں یہ لکڑی بھی چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے۔ اسے بھی اٹھالانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔

دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا دروازے پر جھاڑو لگائی۔ بیٹھک کو گوبر سے لیپا۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا؟ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں بے چارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے لگا۔ وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لیے تیار لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی، جس پر کتنے ہی بھکتوں نے اپنا زور آزمالیا تھا۔ دکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا۔ لکڑی چیرنے کا اسے محاورہ نہ تھا گھاس اس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی۔ یہاں کس کس کر کلہاڑی کا بھرپور ہاتھ جماتا لیکن اس گرہ پر نشان تک نہ پڑتا تھا۔ کلہاڑی اچٹ جاتی۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اٹھتا تھا۔ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ہوائیاں اڑ رہی تھیں، پھر بھی اپنا کام کیے جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا تو شاید کچھ طاقت آجاتی۔ اس نے سوچا یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گا۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑی ہی پیتے ہیں۔ یکا یک اسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔ اس کے یہاں ضرور چلم تمباکو ہوگی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا۔ خیر محنت پھل ہوئی۔ اس نے تمباکو اور چلم دی۔ لیکن آگ وہاں نہ تھی۔ دکھی نے کہا۔ ''آگ کی فکر نہ کرو بھائی پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا۔ وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی۔''

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے سامنے دروازہ پر کھڑا ہو کر بولا۔ ''مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لیں۔''

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتانی نے پوچھا۔ ''یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے؟''

''ارے وہی سسرا دکھیا چمار ہے۔ کہا ہے تھوڑی سی لکڑی چیر دے۔ آگ ہے تو دے دو۔!''

پنڈتانی نے بھنویں چڑھا کر کہا۔ ''تمھیں تو جیسے پوتھی پترے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی۔ چمار ہو، دھوبی ہو، پاسی ہو، منہ اٹھائے گھر میں چلے آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا کوئی سرائے ہوئی۔ کہہ دو ڈیوڑھی سے چلا جائے۔ ورنہ اسی آگ سے منہ جھلس دوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔''

پنڈت جی نے انھیں سمجھا کر کہا۔ ''اندر آ گیا تو کیا ہوا۔ تمھاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی۔ زمین پاک ہے۔ ذراسی آگ کیوں نہیں دے دیتیں؟ کام تو ہمارا ہی کر رہا ہے۔ کوئی لکڑ ہارا یہی لکڑی پھاڑتا تو کم از کم چار آنے لیتا۔''

پنڈتانی نے گرج کر کہا۔ ''وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟''

پنڈت نے ہار کر کہا۔ ''سسرے کی بدقسمتی تھی۔''

پنڈتانی۔ ''اچھا اس وقت تو آگ دے دیتی ہوں لیکن پھر جو اس گھر میں آئے گا تو منہ جھلس دوں گی۔''

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بے چارا پچھتا رہا تھا۔ ناحق آیا۔ سچ تو کہتی ہیں۔ پنڈت کے گھر چمار کیسے چلا آئے۔ یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں تب ہی تو اتنا مان ہے۔ چمار تھوڑے ہی ہیں۔ اسی گاؤں میں بوڑھا ہو گیا مگر مجھے اتنی اکل (عقل) بھی نہ آئی۔ اسی لیے جب پنڈتانی جی آگ لے کر نکلیں تو جیسے اسے جنت مل گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔ ''پنڈتانی ماتا، مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ گھر سے چلا آیا۔ چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری۔ اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے؟''

پنڈتانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ انھوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگھٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری اس کے سر پر پڑ گئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر جھاڑنے لگا۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے۔ بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی۔ اسی لیے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے اور سب کے روپے مارے جاتے ہیں برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے۔ گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل کر گرنے لگیں۔

باہر آ کر اس نے چلم پی اور کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پر آگ پڑ گئی تو پنڈتانی کو کچھ رحم آ گیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اٹھے تو بولیں۔ ''اس چمرا کو بھی کچھ کھانے کو دے دو۔ بے چارہ کب سے کام کر رہا ہے۔ بھوکا ہوگا۔''

پنڈت جی نے اس تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔

''روٹیاں ہیں۔''

پنڈتانی: دو چار بچ جائیں گی۔

پنڈت: دو چار روٹیوں سے کیا ہوگا۔ یہ چمار ہے۔ کم از کم سیر بھر چڑھا جائے گا۔

پنڈتانی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ''ارے باپ رے، سیر بھر! تو پھر رہنے دو۔''

پنڈت جی نے اب شیر بن کر کہا۔ '' کچھ بھوسی چوکر ہو تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو۔ سالے کا پیٹ بھر جائے گا۔ پتلی روٹیوں سے ان کمینوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ انھیں تو جوار کا ٹکر چاہیے۔''

پنڈتانی نے کہا۔ ''اب جانے بھی دو۔ دھوپ میں مرے۔''

(۳)

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی۔ دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آ گئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی گونڈ آ گیا۔ بولا۔ ''بوڑھے دادا جان کیوں دیتے ہو تمھارے پھاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی۔ ناحق ہلکان ہوتے ہو۔''

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا۔ ''بھائی۔ ابھی گاڑی پر بھوسہ ڈھونا ہے۔''

گونڈ: کچھ کھانے کو بھی دیا یا کام ہی کروانا جانتے ہیں، جا کے مانگتے کیوں نہیں؟

دکھی: تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا برہمن کی روٹی ہم کو پچے گی؟

گونڈ: پچنے کو تو پچ جائے گی مگر ملے تو۔ خود تو مونچھوں پر تاؤ دے کر کھانا کھایا اور آرام سے سو رہے ہیں۔ تمھارے لیے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگا دیا۔ زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ حاکم بھی بیگار لیتا ہے تو تھوڑی بہت مزدوری دے دیتا ہے۔ یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس پر دھرماتما بنتے ہیں۔

دکھی نے کہا۔ ''بھائی آہستہ بولو۔ کہیں سن لیں گے، تو بس!''

یہ کہہ کر دکھی پھر سنبھل پڑا اور کلہاڑی چلانے لگا۔ گونڈ کو اس پر رحم آ گیا۔ کلہاڑی ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا۔ لیکن گانٹھ پر ذرا بھی نشان نہ ہوا۔ بالآخر اس نے کلہاڑی پھینک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ ''یہ تمھارے پھاڑنے سے نہ پھٹے گی۔ خواہ تمھاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔''

دکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ اُنھوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی تھی کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کروں گا۔ ابھی گھر پر سو کام پڑے ہیں۔ کام کاج والا گھر ہے ایک نہ ایک چیز گھٹتی رہتی ہے مگر انھیں ان کی کیا فکر؟ چلوں جب تک بھوسہ ہی اُٹھالاؤں۔ کہہ دوں گا آج تو لکڑی نہیں پھٹتی۔ کل آکر پھاڑ دوں گا۔

اس نے ٹوکرا اُٹھایا اور بھوسہ ڈھونے لگا۔ کھلیان یہاں سے دو فرلانگ سے کم نہ تھا۔ اگر ٹوکرا خوب خوب بھر بھر کر لاتا تو کام جلد ہو جاتا مگر سر پر اُٹھاتا کون؟ خود اس سے نہ اُٹھ سکتا تھا۔ اس لیے تھوڑا تھوڑا لاتا تھا۔ چار بجے کہیں بھوسہ ختم ہوا۔ پنڈت جی کی نیند بھی کھلی۔ منہ ہاتھ دھوئے پان کھایا اور باہر نکلے۔ دیکھا تو دکھی ٹوکرے پر سر رکھے سو رہا ہے۔ زور سے بولے۔

ارے دکھیا! تو سو رہا ہے لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہے۔ اتنی دیر تو کیا کرتا رہا؟ مٹھی بھر بھوسہ اُٹھانے میں شام کر دی۔ اس پر سو رہا ہے۔ کلہاڑی اُٹھا لے اور لکڑی پھاڑ ڈال۔ تجھ سے قط بھر لکڑی بھی نہیں پھٹتی۔ پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی۔ مجھے دوش مت دینا، اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جہاں نیچ کے گھر کھانے کو ہوا، اُس کی آنکھ بدل جاتی ہے۔

دکھی نے پھر کلہاڑی اُٹھائی جو باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی تھیں۔ وہ سب بھول گیا۔ پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا۔ آج صبح ناشتہ تک نہ کیا تھا۔ فرصت ہی نہ ملی اُٹھنا بیٹھنا تک پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ دل ڈوبا جاتا تھا۔ پر دل کو سمجھا کر اُٹھا۔ پنڈت ہیں کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں تو پھر ستیہ ناس ہو جائے۔ جب ہی تو ان کا دنیا میں اتنا مان ہے۔ ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے جسے چاہیں بنا دیں جسے چاہیں بگاڑ دیں۔ پنڈت جی گانٹھ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ ہاں مار کس کے اور کس کے مار، ابے زور سے مار تیرے ہاتھ میں تو جیسے دم ہی نہیں۔ لگا کس کے، کھڑا کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے۔ ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے۔ اسی سوراخ میں۔

دکھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ نہ معلوم کوئی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی۔ تکان، بھوک، پیاس، کمزوری، سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے قوتِ بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی اور دکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ لمبی چکر کھا کر گر پڑا۔ بھوکا پیاسا، تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔ پنڈت جی نے پکارا ''اُٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔ پتلی پتلی چیلیاں ہو جائیں۔''

دکھی نہ اٹھا۔

پنڈت جی نے اب اسے دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر جا کر بوٹی چھانی۔ حاجات ضروری سے فارغ ہوئے۔ نہایا اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے۔

دکھی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ زور سے پکارا ''ارے دکھی'' کیا پڑے ہی رہو گے؟

چلو تمھارے ہی گھر چل رہا ہوں۔ سب سامان ٹھیک ہے نا؟

دکھی پھر بھی نہ اٹھا۔

اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ بدحواس ہو کر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے۔ ''دکھیا تو جیسے مر گیا۔''

پنڈتانی جی تعجب انگیز لہجہ میں بولیں۔ ''ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا نا؟''

ہاں لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا۔ اب کیا ہوگا؟

پنڈتانی نے مطمئن ہو کر کہا۔ ''ہوگا کیا، چمرونے میں کہلا بھیجو، مردہ اٹھا لے جائیں۔''

دم کے دم میں یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے۔ صرف ایک گھر گونڈ کا تھا۔ لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ کنویں کا راستہ ادھر ہی سے تھا۔ پانی کیوں کر بھرا جائے؟ چمار کی لاش کے پاس ہو کر پانی بھرنے کون جائے۔ ایک بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا۔ ''اب مردہ کیوں نہیں اُٹھواتے۔ کوئی گاؤں میں پانی پیے گا یا نہیں؟''

ادھر گونڈ نے چمرونے میں جا کر سب سے کہہ دیا۔ ''خبردار مردہ اُٹھانے مت جانا۔ ابھی پولیس کی تحقیقات ہوگی۔ دل لگی ہے کہ ایک غریب کی جان لے لی۔ پنڈت ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ لاش اُٹھاؤ گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔''

اس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے۔ پر چمرونے میں کوئی آدمی لاش اُٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں اور پنڈت جی کے دروازے پر آ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں۔ کوئی روتی تھی، کوئی سمجھاتی تھی۔ پر چمار ایک بھی نہ تھا۔ پنڈت جی نے ان سب کو بہت دھمکایا، سمجھایا، منت کی، پر چماروں کے دل پر پولیس کا ایسا رعب چھایا کہ ایک بھی من نہ سکا۔ آخر ناامید ہو کر لوٹ آئے۔

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہوگیا مگر لاش اُٹھانے کوئی چمار نہ آیا اور برہمن چمار کی لاش کیسے اُٹھائے؟ بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہے۔ کہیں کوئی دکھادے۔

پنڈتانی نے جھنجھلا کر کہا۔''ان ڈائنوں نے تو کھوپڑی چاٹ ڈالی سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا۔''

پنڈت نے کہا۔''چڑیلوں کو رونے دو۔ کب تک روئیں گی۔ جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ مرگیا تو شور وغل مچانے کے لیے سب کی سب آپہنچیں۔''

پنڈتانی: چماروں کا رونا منحوس ہے۔

پنڈت: ہاں بہت منحوس۔

پنڈتانی: ابھی سے بو آنے لگی۔

پنڈت: چمار تھا، سرا کہیں کا۔ ان سبھوں کو کھانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا۔

پنڈتانی: ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی۔

پنڈت: سب کے سب بھرشٹ ہیں۔

رات تو کسی طرح کٹی۔ مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی۔

پنڈت جی نے ایک رسّی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسّی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں کے باہر لے گئے۔

وہاں سے آکر فوراً نہائے۔ درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔

اُدھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔

(یہ افسانہ پہلی بار کلکتہ کے ہندی ماہنامہ 'وشال بھارت' کے اکتوبر ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا سدگتی۔ مان سرور نمبر ۴ میں شامل ہے۔ اردو میں آخری تحفہ میں شامل ہے)

ٹھاکر کا کنواں

جوکھو نے لوٹا منھ سے لگایا تو پانی میں سخت بدبو آئی۔ گنگی سے بولا۔ یہ کیسا پانی ہے؟ مارے باس کے پیا نہیں جاتا۔ گلا سوکھا جارہا ہے۔ اور تو سڑا ہوا پانی پلائے دیتی ہے۔

گنگی پرتی دن شام کو پانی بھر لیا کرتی تھی۔ کنواں دور تھا۔ بار بار جانا مشکل تھا۔ کل وہ پانی لائی تو اس میں بو بالکل نہ تھی آج پانی میں بدبو کیسی؟ لوٹا ناک سے لگایا تو سچ مچ بدبو تھی، ضرور کوئی جانور کنوئیں میں گر کر مر گیا ہوگا، مگر دوسرا پانی آوے کہاں سے؟

ٹھاکر کے کنوئیں پر کون چڑھنے دے گا۔ دور سے لوگ ڈانڈ بتائے گئے ساہو کا کنواں گاؤں کے اس سرے پر ہے، پرنتو وہاں بھی کون پانی بھرنے دے گا؟ چوتھا کنواں گاؤں میں ہے نہیں۔

جوکھو کئی دن سے بیمار ہے۔ کچھ دیر تک تو پیاس روکے چپ پڑا رہا، پھر بولا، اب تو مارے پیاس کے رہا نہیں جاتا۔ لا، تھوڑا پانی ناک بند کر کے پی لوں۔

گنگی نے پانی نہ دیا۔ خراب پانی پینے سے بیماری بڑھ جائے گی۔ اتنا جانتی تھی، پرنتو یہ نہ جانتی تھی کہ پانی کو ابال دینے سے اس کی خرابی جاتی رہتی ہے۔ بولی یہ پانی کیسے پیو گے؟ نہ جانے کون جانور مرا ہے۔ کنوے سے میں دوسرا پانی لائے دیتی ہوں۔

جوکھو نے آشچریہ سے اس کی اور دیکھا۔ دوسرا پانی کہاں سے لائے گی؟

ٹھاکر اور ساہو کے دو کنوئیں تو ہیں۔ کیا ایک لوٹا پانی نہ بھرنے دیں گے؟

ہاتھ۔ پاؤں تڑوا آئے گی اور کچھ نہ ہوگا۔ بیٹھ چپکے سے۔ برہمن دیوتا آشیرواد (دعا) دیں گے۔ ٹھاکر لاٹھی ماریں گے، ساہو جی ایک کے پانچ لے گئے۔ غریبوں کا درد کون سمجھتا ہے۔ ہم تو مر بھی جاتے ہیں، تو کوئی دوار پر جھانکنے نہیں آتا، کندھا دینا تو بڑی بات ہے، ایسے لوگ کنوئیں سے پانی بھرنے دیں گے۔

ان شبدوں میں کڑواستیہ تھا۔ گنگی کیا جواب دیتی، کنّو اس نے وہ بدبودار پانی پینے کو نہ دیا۔

(۲)

رات کے نو بجے تھے۔ تھکے ماندے مزدور تو سو چکے تھے۔ ٹھاکر کے دروازے پر دس پانچ بے فکر جمع تھے۔ میدانی بہادری کا تو اب زمانہ رہا ہے۔ نہ موقع۔ کانونی بہادری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کتنی ہوشیاری سے ٹھاکر نے تھانے دار کو ایک خاص مقدمے میں رشوت دے دی۔ اور صاف نکل گئے۔ کتنی عقل مندی سے ایک معرکہ کے مقدمے کی نقل لے آئے۔ ناظر اور مہتمم سبھی کہتے تھے۔ نقل نہیں مل سکتی۔ کوئی پچاس مانگتا کوئی سو یہاں بے پیسے کوڑی نقل اڑا دی۔ کام کرنے کا ڈھنگ چاہیے۔

کسی سمے گنگی کنوئیں سے پانی لینے پہنچی۔

کوپی کی دھندلی روشنی کنوئیں پر آ رہی تھی۔ گنگی جگت کی آڑ میں بیٹھی موقع کا انتظار کرنے لگی۔ اسی کنوئیں کا پانی سارا گاؤں پیتا ہے۔ کسی کے لیے روک نہیں، صرف یہ بدنصیب نہیں بھر سکتے۔

گنگی کا وِدروہی دل رواجی پابندیوں اور مجبوریوں پر چوٹیں کرنے لگا۔ ہم کیوں نیچ ہیں۔ یہ لوگ کیوں اونچے ہیں؟ اس لیے کہ یہ لوگ گلے میں تاگا ڈال لیتے ہیں یہاں تو جتنے ہیں، ایک سے ایک چھنٹے ہیں؟ چوری یہ کریں، جال فریب یہ کریں، جھوٹے مقدمے یہ کریں، ابھی اس ٹھاکر نے تو اس دن بے چارے گڑریا کی ایک بھیڑ چرالی تھی۔ اور بعد میں مار کر کھا گیا۔ انہی پنڈت جی کے گھر میں تو بارہوں مانس جوا ہوتا ہے۔ یہی ساہو جی تو گھی میں تیل ملا کر بیچتے ہیں۔ کام کرا لیتے ہیں۔ مزدوری دیتے نانی مرتی ہے۔ کس بات میں ہیں ہم سے اونچے۔ ہاں، منہ میں ہم سے اونچے ہیں۔ ہم گلی۔ گلی چلاتے نہیں کہ ہم اونچے ہیں، کبھی گاؤں میں آجاتی ہوں تو رس بھری آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ جیسے سب کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ پرنتو گھمنڈ یہ کہ ہم اونچے ہیں۔

کنوئیں پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ گنگی کی چھاتی دھک۔ دھک کرنے لگی۔ کہیں دیکھ لیں، تو غضب ہو جائے۔

ایک لات بھی تو نیچے نہ پڑے۔ اس نے گھڑا اور رسی اٹھالی۔ اور جھک کر چلتی ہوئی ایک ورکش (درخت) کے اندھیرے سائے میں جا کھڑی ہوئی۔ کب ان لوگوں کو دیا آتی ہے کسی پر۔ بے

چارے مہنگو کو اتنا مارا کہ مہینوں لہو تھوکتا رہا۔ اسی لیے تو کہ اس نے بے گار نہ دی تھی۔ اس پر یہ لوگ اونچے بنتے ہیں۔

کنوئیں پر دو استریاں پانی بھرنے آئی تھیں۔ ان میں باتیں ہو رہی تھیں۔

کھانا کھانے چلے اور حکم ہوا کہ تازہ پانی بھر لاؤ۔ گھڑے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔

ہم لوگوں کو آرام سے بیٹھے دیکھ کر جیسے مردوں کو جلن ہوتی ہے۔

ہاں، یہ تو نہ ہوا کہ کلسا اٹھا کر بھر لاتے۔ بس حکم چلا دیا کہ تازہ پانی لاؤ۔ جیسے ہم لونڈیاں ہی تو ہیں۔

لونڈیاں نہیں تو اور کیا ہو تم؟ روٹی کپڑا نہیں پاتی؟ دس پانچ روپے چھین جھپٹ کر لے ہی لیتی ہو۔ اور لونڈیاں کیسی ہوتی ہیں۔

مت لاجاؤ دیدی۔ چھن بھر آرام کرنے کو جی ترس کر رہ جاتا ہے۔ اتنا کام کسی دوسرے کے گھر کر دیتی تو اس سے کہیں آرام سے رہتی۔ اوپر سے وہ احسان مانتا۔ یہاں کام کرتے کرتے مر جاؤ پر کسی کا منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔ دونوں پانی بھر کر چلی گئی تو گنگی ورکش کی چھایا سے نکلی اور کنوئیں کے جگت کے پاس آئی۔ بے فکرے چلے گئے تھے۔ ٹھاکر بھی دروازہ بند کر اندر آنگن میں سونے جارہے تھے۔ گنگی نے چھڑک (وقتی عارضی) سکھ کی سانس لی۔ کسی طرح میدان تو صاف ہوا۔ امرت چرالانے کے لیے جو راج کمار کسی زمانے میں گیا تھا وہ بھی شاید اتنی ساؤدھانی کے ساتھ اور سمجھ بوجھ کر نہ گیا ہوگا۔ گنگی دبے پاؤں کنوئیں کے جگت پر چڑھی۔ وجے کا ایسا انوبھوا سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

اس نے رسّی کا پھندا گھڑے میں ڈالا۔ دائیں بائیں چوکنی درشٹی سے دیکھا۔ جیسے کوئی سپاہی رات کو شترو کے قلعے میں سوراکھ کر رہا ہو۔ اگر اس سمے وہ پکڑ لی گئی تو پھر اس کے لیے معافی یا رعایت کی رتی بھر امید نہیں۔ انت میں دیوتاؤں کو یاد کر کے اس نے کلیجا مضبوط کیا اور گھڑا کنوئیں میں ڈال دیا۔

گھڑے نے پانی میں غوطہ لگایا، بہت ہی آہستہ ذرا بھی آواز نہ ہوئی، گنگی نے دو چار ہاتھ جلدی جلدی مارے۔ گھڑا کنوئیں کے منہ تک آپہنچا کوئی بڑا شہزور پہلوان بھی اتنی تیزی سے اسے نہ کھینچ سکتا تھا۔

گنگی جھکی کہ گھڑے کو پکڑ کر جگت پر رکھے کہ یکا یک ٹھاکر صاحب کا دروازہ کھل گیا۔ شیر کا منہ اس

سے ادھیک بھیا تک نہ ہو گا۔

گنگی کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی۔ رسّی کے ساتھ گھڑا دھڑام سے پانی میں گرا اور کئی چھڑ تک پانی میں ہلکورے کی آوازیں سنائی دیتی رہی۔

ٹھاکر کون ہے، کون ہے؟ پکارتے ہوئے کنوئیں کے پاس آر ہے تھے اور گنگی جگت سے کود کر بھاگی جارہی تھی۔ گھر پہنچ کر دیکھا کہ جوکھو لوٹا منہ سے لگائے وہی میلا گندا پانی پی رہا ہے۔

نوٹ: یہ افسانہ ہندی میں جاگرن اگست ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ مان سرور ا میں شامل ہے اور اردو میں شائع نہیں ہوا۔

عیدگاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سُہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچّہ کی طرح پُرتبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریادل ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارک باد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں۔ اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا۔ وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصّہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آ گئی۔

اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سِوَیّوں کے لیے گھر میں دودھ، شکر اور میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انھیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی ساری نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچّہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے، کون سننے والا تھا۔ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے۔ اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر

آئیں گے۔ امّی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہیں۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پُرانی دھرانی ٹوپی ہے، جس کا گوٹا سیاہ ہوگیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن، نور اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے، اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جاکر امینہ سے کہتا ہے۔ ''تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔'' لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جارہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں، امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا، پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوئیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا۔ کیا اس وقت سوئیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہیمن کے کپڑے سیے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنّی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے۔ لیکن کل گھر میں اور پیسے نہ تھے اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے، دینے پڑے۔ حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کُل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن کبھی تو آئیں گی۔ سب کو سوئیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے۔ یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں؟

شہر کا سواد شروع ہوگیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اُٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا اُلّو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے۔ اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی۔ بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی

بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہوگئے اب تک پڑھتے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سی ڈاڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔ گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کودن غبی۔ کام سے جی چرانے والے۔ یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں، وہ سب بتلا دیتا ہے اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ، ہماری اماں کو وہ دے دو۔ کیا کہلاتا ہے ''بیٹ'' تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا۔ ''ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم۔''

حامد نے اس سے اختلاف کیا۔ چلو، منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آجائے۔

محسن۔ ''لیکن دوڑتی تو نہیں، اچھل کود نہیں سکتیں۔''

حامد۔ ''کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمھاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمھاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔''

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دُکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں، اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا، ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔ سُنا ہے رات کو ایک جنات ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ''ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے۔''

محسن۔ ''جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں۔ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب، آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہوگئے اُسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔''

حامد۔ ''جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔''

محسن۔ ''اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے، اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔''

سمیع۔ ''سنا ہے چودھری صاحب کے قبضے میں بہت سے جنات ہیں، کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے۔ کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آ کر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔''

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے، اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آ کر روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلیے۔ یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ ،لِپ ،پھام ،پھو۔!''

نوری نے تصحیح کی۔ ''یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تمھیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت! یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں، سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلّہ میں چوروں سے کہتے ہیں، چوری کرو اور دوسرے محلّے میں پکارتے ہیں، جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں، لیکن تھیلیاں بھر بھر کے گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم تھیلیاں بھر بھر کے۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ کہاں سے لاتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے۔ بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں۔''

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ ''ارے احمق۔ انھیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے۔ اللہ قسم، پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔''

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے، کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر، چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اُڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن، صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر خبر نہ ہوتی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہوگئی ہے۔ اوپر املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے، جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری۔ خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں، جو آتے جاتے ہیں، پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں۔ ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے، گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پُر احترام رُعب انگیز نظارہ ہے۔ جس سے ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

(2)

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دل چسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوتے۔ کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزا لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں، اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا۔ حامد سوچتا ہے، کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ران سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کے بغل میں

ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوب صورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے۔ خاکی وردی اور لال پگڑی۔ کندھے پر بندوق۔ معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آرہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ۔ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں، کھلونے فضول ہیں، کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ ڈھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے۔ ''میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح و شام۔''

محمود۔ ''اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فائر کر دے گا۔''

نوری۔ ''اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا اور روز روپے لائے گا۔''

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی ہی کے تو ہیں۔ گریں تو چکنا چور ہو جائیں۔ وہ چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے میں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے طرح طرح کی ضروری چیزیں، ایک اور بچھی ہوئی ہیں۔ گیند، سیٹیاں، بگل، بھونرے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ وہ ایک سیٹی لیتا ہے، محمود گیند، نوری ربڑ کا بط جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک بانسری۔ اسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لیے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دل چسپی تازہ ہے۔ بچارا یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں۔ کسی نے گلاب جامن۔ کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کم بخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟''

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا، پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منھ میں رکھ لیں۔ محمود، نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا۔ ''اچھا اب ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ حامد اللہ قسم۔''

حامد نے کہا۔ ''رکھیے رکھیے۔ کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

سمیع بولا۔ ''تین ہی پیسے تو ہیں۔ کیا کیا لو گے؟''

محمود۔ ''تم اس سے مت بولو۔ حامد میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو!''

حامد۔ ''مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔''

محسن۔ ''لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں۔ اپنے پیسے کو نہیں نکالتے۔''

محمود۔ ''میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے، تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا کر کھائے گا۔''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دل چسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اُتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ، مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے پھر تو انھیں کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عید گاہ نہیں جا سکے ہیں، ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اُتار لو۔ چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں۔ کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھولاؤ۔ اب اگر

میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں، آپ منہ نہ لگا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہوگی۔ اس نے پھر سوچا۔ اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی اماں کے لیے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ کون نہیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں، جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا وہ کھلونے کھیلیں، مٹھائیاں کھائیں، میں غریب سہی، کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لوگے۔ ایک ایک کو ایک ایک ٹوکری دوں اور دکھادوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں، سب کو اچھے اچھے کُرتے دلوادوں گا اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں، تو چڑھا چڑھا کر کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے دوڑتے دوڑتے دکاندار سے پوچھا۔ ''یہ دست پناہ بیچو گے؟''

دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ ''وہ تمھارے کام کا نہیں ہے۔''

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔''

تو بتلاتے کیوں نہیں، کے پیسے کا دوگے؟''

''چھ پیسے لگیں گے۔''

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ ''تین پیسے لوگے۔'' اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے مگر دکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔ محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کرے گا؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ ''ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرادو۔ ساری پسلیاں چور چور

ہو جائیں گی بچا کی۔''

محمود۔''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد۔''کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمھاری ناک پکڑلوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمھارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!''

سمیع متاثر ہو کر بولا۔''میری خنجری سے بدلو گے۔ دو آنے کی ہے۔''

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔''میرا دست پناہ چاہے تو تمھاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلّی لگا دی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا؟''

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود، محسن اور نوری ایک طرف، حامد یکہ و تنہا دوسری طرف، سمیع غیر جانب دار ہے۔ جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحادِ ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ اور لکڑی کی چیزیں، دوسری جانب اکیلا لوہا۔ جو اس وقت اپنے کو قوی کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر، یہ رستمِ ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔''اچھا تمھارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔''

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا۔''یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے

دروازے پر چھڑ کنے لگے گا۔ جناب پھر اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر ڈالو۔''

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ ''بچا گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولیے جناب!''

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔ ''اسے پکڑنے کون آئے گا؟''

محمود نے کہا۔ ''یہ سپاہی بندوق والا۔''

حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔ ''یہ بے چارے اس رستمِ ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بے چارے۔''

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا۔ ''تمھارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا۔''

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ ''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمھارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے، جو رستم ہی کر سکتا ہے۔''

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا۔ ''تمھارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔'' اس حملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ ''بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔'' حامد نے دھاندلی کی۔ ''میرا دست پناہ باورچی خانہ میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔''

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند، سیٹی اور ربط ریز رو تھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان پٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستمِ ہند ہے۔ اس میں کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے، وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار۔ دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا۔ ہمیشہ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا۔ ''ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو۔'' حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن، محمود، نوری اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوب صورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں مگر ان کھلونوں کے لیے انھیں دعا کون دے گا؟ کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا، جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا۔ حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے۔ حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستمِ ہند کی برکت تھی۔

(3)

گیارہ بجے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی۔ میلے والے آگئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی کے جو اُچھلی تو میاں بہشتی نیچے آرہے اور عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے، ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں، دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کے پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ ان پر چیڑ کا ایک پرانا پٹرا رکھا گیا۔ پٹرے پر سُرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین کے تھا۔ وکیل صاحب عالمِ بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالمِ بالا سے دنیائے فانی میں آرہے اور ان کے جسدِ خاکی کے پُرزے ہوگئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی تاکہ بیکار نہ جاکر زاغ و زغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں پر چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے ''تھونے والے داگتے لہو'' پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نَم اور بھاٹیا اس کی شاگردی

کر سکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیے۔ گولر کا دودھ آتا ہے، ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عملِ جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا، نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

''یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا۔''

''میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔''

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ ''یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہو گئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز ہی نہ ملی۔''

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ ''تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔''

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہو گیا اور شفقت بھی وہ نہیں، جو پُر بیان ہوتی ہے اور اپنی تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی، درد، التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے۔ مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے۔ اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیوں کر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اُسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آ جائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔ اور تب ایک بڑی دل چسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

(یہ افسانہ پہلی بار دلی کے اردو رسالہ 'عصمت' کے ۱۹۳۳ کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ 'دودھ کی قیمت' میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ الہ آباد کے ماہنامہ 'چاند' کے اگست ۱۹۳۳ کے شمارے میں شامل ہے۔ یہ 'مان سروور ۱' میں شائع ہوا ہے۔)

نشہ

(۱)

ایشوری ایک بڑے زمیندار کا لڑکا تھا اور میں ایک غریب کلرک تھا، جس کے پاس محنت مجوری کے سوا اور کوئی جائداد نہ تھی۔ ہم دونوں میں پرسپر بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں زمینداری کی برائی کرتا، انھیں ہنسک پشو اور خون چوسنے والی جونک اور ورکشوں کی چوٹی پر پھولنے والا بانجھا کہتا۔ وہ زمینداروں کا پکش لیتا، پر سوبھاؤتہ اس کا پہلو کچھ کمزور ہوتا تھا، کیوں کہ اس کے پاس زمینداروں کے انوکول کوئی دلیل نہ تھی۔ یہ کہنا کہ سبھی منشیہ برابر نہیں ہوتے۔ چھوٹے بڑے ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لچر دلیل تھی۔ کسی منشیہ یا نیتک نیم سے اس ویوستھا کا اوچتیہ سدھ کرنا کٹھن تھا۔ میں اس واد وواد کی گرماگرمی میں اکثر تیز ہو جاتا اور لگنے والی بات کہہ جاتا، لیکن ایشوری ہار کر بھی مسکراتا رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی گرم ہوتے نہیں دیکھا۔ شاید اس کا کارن یہ تھا کہ وہ اپنے پکش کی کمزوری سمجھتا تھا۔ نوکروں سے وہ سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ امیروں میں جو ایک بے دردی اور اُدنڈتا ہوتی ہے، اس کا اُسے بھی پرچر بھاگ ملا تھا۔ نوکر نے بستر لگانے میں ذرا بھی دیر کی، دودھ ضرورت سے زیادہ گرم یا ٹھنڈا ہوا، سائیکل اچھی طرح صاف نہیں ہوئی، تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ سستی یا بدتمیزی اُسے ذرا بھی برداشت نہ تھی، پر دوستوں سے اور وشیش کر مجھ سے اس کا ویوہار سوہارد اور نرمتا سے بھرا ہوتا تھا۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتا، تو مجھ میں بھی وہی کٹھورتائیں پیدا ہو جاتی، جو اس میں تھی، کیوں کہ میرا لوک پریم سدھانتوں پر نہیں نجی دشاؤں پر ٹکا ہوا تھا، لیکن وہ میری جگہ ہو کر بھی شاید امیر ہی رہتا، کیوں کہ وہ پراکرتی سے ہی ولاسی اور ایشوریہ پریہ تھا۔

اب کی دشہرے کی چھٹیوں میں، میں نے نشچے کیا کہ گھر نہ جاؤں گا۔ میرے پاس کرایے کے لیے روپے نہ تھے اور نہ میں گھر والوں کو تکلیف دینا چاہتا تھا۔ میں جانتا ہوں، وے مجھے جو کچھ دیتے ہیں وہ ان کی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی پریکشا کا بھی خیال تھا۔ ابھی بہت

کچھ پڑھنا باقی تھا اور گھر جا کر کون پڑھتا ہے۔ بورڈنگ ہاؤس میں بھوت کی طرح اکیلے پڑے رہنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن ایشوری نے مجھے اپنے گھر چلنے کا نیوتہ دیا، تو میں بنا آگرہ کے راضی ہو گیا۔ ایشوری کے ساتھ پریکشا کی تیاری خوب ہو جائے گی۔ وہ امیر ہو کر بھی محنتی اور ذہین ہے۔

اس نے اس کے ساتھ ہی کہا۔ لیکن بھائی ایک بات کا خیال رکھنا۔ وہاں اگر زمینداروں کی نندا کی تو معاملہ بگڑ جائے گا اور میرے گھر والوں کو بُرا لگے گا۔ وہ لوگ تو آسامیوں پر اسی دعوے سے شاسن کرتے ہیں کہ ایشور نے آسامیوں کو ان کی سیوا کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ آسامی بھی یہی سمجھتا ہے۔ اگر اسے سوجھا دیا جائے کہ زمیندار اور آسامی میں کوئی مولک بھید نہیں ہے تو زمینداری کا کہیں پتہ نہ لگے۔

میں نے کہا۔'' تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں وہاں جا کر کچھ اور ہو جاؤں گا؟''

ہاں میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

تو تم غلط سمجھتے ہو۔

ایشوری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ کداچت اس نے اس معاملے کو میرے وِویک پر چھوڑ دیا اور بہت اچھا کیا۔ اگر وہ اپنی بات پر اڑتا تو میں بھی ضد پکڑ لیتا۔

(۲)

سیکنڈ کلاس تو کیا میں نے کبھی انٹر کلاس میں بھی سفر نہ کیا تھا۔ اب کی سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا سوبھاگیہ پراپت ہوا۔ گاڑی تو نو بجے رات کو آتی تھی۔ پر یاترا کے ہرش میں ہم شام کو ہی اسٹیشن جا پہنچے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر سیر کرنے کے بعد رفریش مینٹ روم میں جا کر ہم لوگوں نے بھوجن کیا۔ میری ویش بھوشا اور رنگ ڈھنگ سے پارکھی خانساموں کو یہ پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ مالک کون ہے اور پچھلگو کون، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُن کی گستاخی بُری لگ رہی تھی۔ پیسے ایشوری کے جیب سے گئے۔ شاید میرے پتا کو جو ویتن ملتا ہے، اس سے زیادہ ان خانساموں کو انعام اکرام میں مل جاتا ہو۔ ایک اٹھنی تو چلتے سے ایشوری ہی نے دی۔ پھر بھی میں اُن سبھوں سے اُسی تتپرتا اور وِنئے کی پرتیکشا کرتا تھا، جس سے وے ایشوری کی سیوا کر رہے تھے۔ ایشوری کے حکم پر سب کے سب کیوں دوڑتے ہیں۔ لیکن میں کوئی چیز مانگتا ہوں تو اتنا اُتساہ نہیں دکھاتے؟ مجھے بھوجن میں کچھ سواد نہ ملا۔ وہ بھید میرے دھیان کو سمپورن روپ سے اپنی اُور کھینچے ہوئے تھا۔

گاڑی آئی، ہم دونوں سوار ہوئے۔ خانساموں نے ایشوری کو سلام کیا۔ میری اور دیکھا بھی نہیں۔

ایشوری نے کہا۔ کتنے تمیز دار ہیں یہ سب۔ ایک ہمارے نوکر ہیں کہ کوئی کام کرنے کا ڈھنگ نہیں۔

میں نے کھٹے من سے کہا۔ اسی طرح اگر تم اپنے نوکروں کو بھی آٹھ آنے روز انعام دیا کرو تو شاید ان سے زیادہ تمیز دار ہو جائیں۔

''تو کیا تم سمجھتے ہو، یہ سب کیول انعام کی لالچ سے اتنا ادب کرتے ہیں؟''

''جی نہیں، کداپی نہیں، تمیز اور ادب تو ان کے رکت میں مل گیا ہے۔''

گاڑی چلی۔ ڈاک تھی۔ پریاگ سے چلی تو پرتاپ گڑھ جا کر رکی۔ ایک آدمی نے ہمارا کمرہ کھولا۔ میں ترنت چلا اٹھا، دوسرا درجہ ہے، سیکنڈ کلاس ہے۔

اس مسافر نے ڈبے کے اندر آکر میری اور ایک وچتر اُپیکشا کی درشٹی سے دیکھ کر کہا، جی ہاں سیوک بھی اتنا سمجھتا ہے اور بیچ والے برتھ پر بیٹھ گیا۔ مجھے کتنی لجا آئی کہہ نہیں سکتا۔

بھور ہوتے ہوتے ہم لوگ مرادآباد پہنچے۔ اسٹیشن پر کئی آدمی ہمارا سواگت کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ دو بھدر پُرش تھے۔ پانچ بیگار، بیگاروں نے ہمارا لگیج اُٹھایا۔ دونوں بھدر پُرش پیچھے پیچھے چلے۔ ایک مسلمان تھا۔ ریاست علی، دوسرا برہمن تھا۔ رام ہرکھ، دونوں نے میری اور اپرچت نیتروں سے دیکھا، مانو کہہ رہے ہیں، تم کوے ہو کر ہنس کے ساتھ کیسے؟

ریاست علی نے ایشوری سے پوچھا، یہ بابو صاحب کیا آپ کے ساتھ پڑھتے ہیں؟

ایشوری نے جواب دیا۔ ہاں، ساتھ پڑھتے بھی ہیں، اور ساتھ رہتے بھی ہیں؟ یوں کہیے کہ آپ ہی کی بدولت میں الہ آباد پڑا ہوا ہوں، نہیں کب کا لکھنؤ چلا آیا ہوتا۔ اب کی میں انھیں گھسیٹ لایا۔ ان کے گھر سے کئی تار آچکے تھے مگر میں نے انکاری جواب دلوا دیے۔ آخری تار تو ارجنٹ تھا، جس کی فیس چار آنے فی شبد ہے۔ پر یہاں سے بھی اس کا جواب انکاری ہی گیا۔ دونوں سجنوں نے میری اور چکت نیتروں سے دیکھا۔ آتنکت ہو جانے کی چیشٹا کرتے ہوئے جان پڑے۔

ریاست علی نے اردھ شنکا کے سُور میں کہا، لیکن آپ بڑے سادے لباس میں رہتے ہیں۔

ایشوری نے شنکا نوارن کی۔ مہاتما گاندھی کے بھکت ہیں صاحب! کھدر کے سوا کچھ پہنتے ہی

نہیں۔ پرانے سارے کپڑے جلا ڈالے! یوں کہو کہ راجا ہیں۔ ڈھائی لاکھ سالانہ کی ریاست ہے، پر آپ کی مورت دیکھو تو معلوم ہوتا ہے، ابھی اناتھالیہ سے پکڑ کر آئے ہیں۔

رام ہرکھ بولے، امیروں کا ایسا سوابھاؤ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ کوئی بھانپ ہی نہیں سکتا۔

ریاست علی نے سمرتھن کیا۔ آپ نے مہاراج چانگلی کو دیکھا ہوتا تو دانتوں انگلی دباتے۔ ایک گاڑھے کی مرجئی اور چمرودھے جوتے پہنے بازاروں میں گھوما کرتے تھے۔ سنتے ہیں، ایک بار بیگار میں پکڑ گئے تھے اور انھیں نے دس لاکھ سے کالج کھول دیا۔

میں من میں کٹا جا رہا تھا، پر نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ سفید جھوٹ اس وقت مجھے ہاسیہ اسپد نہ جان پڑا۔ اس کے پرتیک واکیہ کے ساتھ مانو میں اس کلپت وَیبھو کے سمیپ تر آتا جاتا تھا۔

میں شہسوار نہیں ہوں۔ ہاں، لڑکپن میں، کئی بار لدو گھوڑوں پر سوار ہوا ہوں۔ یہاں دیکھا تو دو کلاں راس گھوڑے ہمارے لیے تیار کھڑے تھے۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ سوار تو ہوا، پر بوٹیاں کانپ رہی تھیں۔ میں نے چہرے پر شکن نہ پڑنے دیا۔ گھوڑے کو ایشوری کے پیچھے ڈال دیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ایشوری نے گھوڑے کو تیز نہ کیا، ورنہ شاید میں ہاتھ پاؤں تڑوا کر لوٹتا۔ ممکھو ہے، ایشوری نے سمجھ لیا ہو کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔

(۳)

ایشوری کا گھر کیا تھا، قلعہ تھا۔ امام باڑے کا سا پھاٹک، دوار پر پہرے دار ٹہلتا ہوا، نوکروں کا کوئی حساب نہیں، ایک ہاتھی بندھا ہوا۔ ایشوری نے اپنے پتا، چاچا، تاؤ آدی سب سے میرا پریچے کرایا اور اسی آتشیوکت کے ساتھ۔ ایسی ہوا باندھی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ نوکر چاکر ہی نہیں گھر کے لوگ بھی میرا سمّان کرنے لگے۔ دیہات کے زمیندار، لاکھوں کا منافع مگر پولس کانسٹبل کو بھی مجھنے والے۔ کئی مہاشے تو مجھے حضور حضور کہنے لگے۔

جب ذرا اکانت ہوا تو میں نے ایشوری سے کہا، ''تم بڑے شیطان ہو یار، میری مٹی کیوں پلید کر رہے ہو؟''

ایشوری نے سدرڑھ مسکان کے ساتھ کہا، ان گدھوں کے سامنے یہی چال ضروری تھی، ورنہ سیدھے منہ بولتے بھی نہیں۔

ذرا دیر بعد ایک نائی ہمارے پاؤں دبانے آیا۔ کنور لوگ اسٹیشن سے آئے ہیں۔ تھک گئے ہوں

گے۔ ایشوری نے میری اور اشارہ کر کے کہا، پہلے کنور صاحب کے پاؤں دبا۔

میں چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے جیون میں ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ کسی نے میرے پاؤں دبائے ہوں۔ میں اسے امیروں کے چونچلے، رئیسوں کا گدھاپن اور بڑے آدمیوں کی مٹ مردی اور جانے کیا کیا کہہ کر ایشوری کا پریہاس کیا کرتا اور آج میں پوتڑوں کا رئیس بننے کا سوانگ بھر رہا تھا۔

اتنے میں دس بج گئے۔ پرانی سبھیتہ کے لوگ تھے۔ نئی روشنی ابھی کیول پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ پائی تھی۔ اندر سے بھوجن کا بلاوا آیا ہم اسنان کرنے چلے۔ میں ہمیشہ اپنی دھوتی خود چھانٹ لیا کرتا ہوں، مگر یہاں میں نے ایشوری کی بھانتی اپنی دھوتی بھی چھوڑ دی۔ اپنے ہاتھوں اپنی دھوتی چھانٹتے شرم آرہی تھی۔ اندر بھوجن کرنے چلے۔

ہوٹل میں جوتے پہنے میز پر ڈٹتے تھے۔ یہاں پاؤں دھونا آوشیک تھا۔ کہار پانی لیے کھڑا تھا۔ ایشوری نے پاؤں بڑھادیے۔ کہار نے اس کے پاؤں دھوئے۔ میں نے بھی پاؤں بڑھادیے۔ کہار نے میرے پاؤں بھی دھوئے۔ میرا وچار نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

(۴)

سوچا تھا، وہاں دیہات میں اکاگر ہوکر خوب پڑھیں گے۔ پر وہاں سارا دن سیر سپاٹے میں کٹ جاتا تھا۔ کہیں ندی میں بجرے پر سیر کر رہے ہیں۔ کبھی مچھلیوں یا چڑیوں کا شکار کھیل رہے ہیں، کہیں پہلوانوں کی کشتی دیکھ رہے ہیں۔ کہیں شطرنج پر جمے ہوئے ہیں۔ ایشوری خوب انڈے منگواتا اور کمرے میں اسٹوپ پر آملیٹ بنتے۔ نوکروں کا ایک جتھا ہمیشہ گھیرے رہتا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو ہلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیول ایک زبان ہلا دینا کافی ہے۔ نہانے بیٹھے تو آدمی نہلانے کو حاضر، لیٹے تو آدمی پنکھا جھلنے کو کھڑے۔ میں مہاتما گاندھی کا کنور چیلا مشہور تھا۔ بھیتر سے باہر تک میری دھاک تھی۔ ناشتے میں ذرا بھی دیر نہ ہونے پائے۔ کہیں کنور صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ بچھاون ٹھیک سے پر لگ جائے، کنور صاحب کے سونے کا سمے آگیا، میں ایشوری سے بھی نازک ویمان بن گیا تھا یا بننے پر مجبور کیا گیا تھا۔ ایشوری اپنے ہاتھ سے بستر بچھا لے۔ لیکن کنور مہمان اپنے ہاتھوں سے کیسے اپنا بچھاون بچھا سکتے ہیں! ان کی مہانتا میں بٹا لگ جائے گا۔

ایک دن سچ مچ یہی بات ہوگئی، ایشوری گھر میں تھے۔ شاید اپنی ماتا سے کچھ بات چیت کرنے میں

دیر ہوگئی۔ یہاں دس بج گئے۔ میری آنکھیں نیند سے جھپک رہی تھیں۔ مگر بستر کیسے لگاؤں؟ کنور جو ٹھہرا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے مہرا آیا۔ بڑا منہ لگا نوکر تھا۔ گھر کے دھندوں میں میرا بستر لگانے کی اسے سدھ ہی نہ رہی۔ اب جو یاد آئی تو بھاگا ہوا آیا۔ میں نے ایسی ڈانٹ بتائی کہ اس نے بھی یاد کیا ہوگا۔

ایشوری میری ڈانٹ سن کر باہر نکل آیا اور بولا تم نے بہت اچھا کیا۔ یہ سب حرام خور اسی ویوہار کے یوگیہ ہیں۔

اسی طرح ایشوری ایک دن ایک جگہ دعوت میں گیا ہوا تھا۔ شام ہوگئی، پر لیمپ نہ جلا، لیمپ میز پر رکھا ہوا تھا۔ دیا سلائی بھی وہیں تھی لیکن ایشوری خود کبھی لیمپ نہیں جلاتا، پھر کنور صاحب کیسے جلائیں؟ میں جھنجھلا رہا تھا۔ سماچار پتر آیا رکھا ہوا تھا۔ جی ادھر لگا ہوا تھا۔ پر لیمپ ندارد۔ دیو یوگ سے اسی وقت منشی ریاست علی آنکلے۔ میں انھیں پر ابل پڑا۔ ایسی پھٹکار بتائی کہ بے چارا الو ہو گیا۔ تم لوگوں کو اتنی فکر بھی نہیں کہ لیمپ جلوا دو۔ معلوم نہیں ایسے کام چور آدمیوں کا یہاں کیسے گزر ہوتا ہے۔ میرے یہاں گھنٹے بھر نرواہ نہ ہو۔ ریاست علی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لیمپ جلا دیا۔

وہاں ایک ٹھاکر اکثر آیا کرتا تھا۔ کچھ منچلا آدمی تھا۔ مہاتما گاندھی کا پرم بھکت۔ مجھے مہاتما جی کا چیلا سمجھ کر میرا بڑا لحاظ کرتا تھا۔ پر مجھ سے کچھ پوچھتے سنکوچ کرتا تھا۔ ایک دن مجھے اکیلا دیکھ کر آیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔ سرکار تو گاندھی بابا کے چیلے ہیں نہ؟ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سوراج ہو جائے گا تو زمیندار نہ رہیں گے۔

میں نے شان جمائی، زمینداروں کے رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ لوگ غریبوں کا خون چوسنے کے سوا اور کیا کرتے ہیں؟

ٹھاکر نے پھر پوچھا، تو کیوں سرکار، سب زمینداروں کی زمینیں چھین لی جائیں گی؟

میں نے کہا بہت سے لوگ خوشی سے دے دیں گے۔ جو لوگ خوشی سے نہ دیں گے، ان کی زمین چھیننی ہی پڑے گی۔ ہم لوگ تو تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔ جیوں ہی سوراجیہ ہوا اپنے سارے علاقے اسامیوں کے نام ہبہ کر دیں گے۔

میں کرسی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ ٹھاکر میرے پاؤں دبانے لگا۔ پھر بولا آج کل زمیندار لوگ بڑا ظلم کرتے ہیں۔ سرکار! ہمیں بھی حضور اپنے علاقے میں تھوڑی سی زمین دے دیں، تو چل کر وہیں آپ کی سیوا میں رہیں۔

میں نے کہا ابھی تو میرا کوئی اختیار نہیں ہے بھائی، لیکن جوں ہی اختیار ملا، میں سب سے پہلے تمھیں بلاؤں گا۔ تمھیں موٹر ڈرائیوری سکھا کر اپنا ڈرائیور بنا لوں گا۔

سنا، اس دن ٹھاکر نے خوب بھنگ پی اور اپنی استری کو خوب پیٹا اور گاؤں کے مہاجن سے لڑنے پر تیار ہو گیا۔

(۵)

چھٹی اس طرح تمام ہوئی اور ہم پھر پریاگ چلے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ ہم لوگوں کو پہنچانے آئے۔ ٹھاکر تو ہمارے ساتھ اسٹیشن تک آیا۔ میں نے بھی اپنا پارٹ خوب صفائی سے کھیلا اور اپنی کُبیر وچیت ویئے اور دیوتیہ کی میز ہر ایک ہردَے پر لگا دی۔ جی تو چاہتا تھا، ہر ایک کو اچھا انعام دوں، لیکن یہ سامرتھ کہاں تھی؟ واپسی ٹکٹ تھا ہی کیول گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ پر گاڑی آئی تو ٹھسا ٹھس بھری ہوئی۔ درگا پوجا کی چھٹیاں بھوگ کر سبھی لوگ لوٹ رہے تھے۔ سیکنڈ کلاس میں تل رکھنے کی جگہ نہیں، انٹر کلاس کی حالت اس سے بھی بدتر! یہ آخری گاڑی تھی۔ کسی طرح رک نہ سکتے تھے۔ بڑی مشکل سے تیسرے درجہ میں جگہ ملی۔ ہمارے ایشوریہ نے وہاں اپنا رنگ جما لیا، مگر مجھے اس میں بیٹھنا برا لگ رہا تھا۔ آئے تھے آرام سے لیٹے لیٹے، جا رہے تھے سکڑے ہوئے۔ پہلو بدلنے کی بھی جگہ نہ تھی۔

کئی آدمی پڑھے لکھے بھی تھے۔ آپس میں انگریزی راجیہ کی تعریف کرتے جا رہے تھے۔ ایک مہاشے بولے، ایسا نیائے تو کسی راجیہ میں نہیں دیکھا۔ چھوٹے بڑے سب برابر۔ راجا بھی کسی پر انیائے کرے تو عدالت اس کی بھی گردن دبا دیتی ہے۔

دوسرے سجن نے سمرتھن کیا، ارے صاحب آپ خود بادشاہ پر دعوا کر سکتے ہیں! عدالت میں بادشاہ پر ڈگری ہو جاتی ہے۔

ایک آدمی جس کی پیٹھ پر بڑا سا گٹھر بندھا تھا کلکتے جا رہا تھا۔ کہیں گٹھری رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ پیٹھ پر باندھے ہوئے تھا۔ اس سے بے چین ہو کر بار بار دوار پر کھڑا ہو جاتا۔ میں دوار کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بار بار آ کر میرے منہ کو اپنی گٹھری سے رگڑنا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔ ایک تو ہوا یوں ہی کم تھی۔ دوسرے اس گنوار کا آ کر میرے منہ پر کھڑا ہو جانا، مانو میرا گلا دبانا تھا۔ میں کچھ دیر تک ضبط کیے بیٹھا رہا۔ یکا یک مجھے کرودھ آ گیا۔ میں نے اسے پکڑ کر ڈھکیل دیا اور دو طمانچے زور زور سے لگائے۔

اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔ کیوں مارتے ہو بابو جی، ہم نے بھی کرایہ دیا ہے۔

میں نے اُٹھ کر دو تین طمانچے اور جڑ دیے۔

گاڑی میں طوفان آ گیا۔ چاروں اور سے مجھ پر بوچھار پڑنے لگی۔

''اگر اتنے نازک مزاج ہو تو اوّل درجے میں کیوں نہیں بیٹھے؟''

''کوئی بڑا آدمی ہوگا تو اپنے گھر کا ہوگا۔ مجھے اس طرح مارتے تو دکھا دیتا۔''

''کیا قصور کیا تھا بے چارے نے؟ گاڑی میں سانس لینے کی جگہ نہیں، کھڑکی پر ذرا سانس لینے کھڑا ہو گیا تو اس پر اتنا کرودھ! امیر ہو کر کیا آدمی اپنی انسانیت بالکل کھو دیتا ہے؟''

''یہ بھی انگریزی راج ہے، جس کا آپ بکھان کر رہے تھے!''

ایک گرامین بولا۔ ''دفتر ن ماگھسن تو پاوت نہیں، اس پر اتنا مزاج!

ایشوری نے انگریزی میں کہا: What an idiot you are Bir!

اور میرا نشہ کچھ کچھ اُترتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

(یہ افسانہ پہلی بار الہ آباد کے ہندی ماہنامہ 'چاند' کے فروری ۱۹۳۴ کے شمارے میں شائع ہوا۔ اردو میں یہ 'رہنمائے تعلیم ہندی' جنوری ۱۹۳۴ میں شائع ہوا۔ 'مان سروور-۱' میں شامل ہے)

دودھ کی قیمت

(۱)

اب بڑے بڑے شہروں میں دائیاں اور نرسیں بھی نظر آتی ہیں لیکن دیہاتوں میں ابھی تک زچہ خانہ روش قدیم کی طرح بھنگیوں کے ہی دائرۂ اقتدار میں ہے اور ایک عرصہ دراز تک اس میں اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ بابو مہیش ناتھ اپنے گاؤں کے زمیندار ضرور تھے، تعلیم یافتہ بھی تھے، زچہ خانہ کی اصلاح کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن عملی مشکلات کو کیا کرتے۔ دیہات میں جانے کو کوئی نرس راضی بھی ہوئی تو ایسا معاوضہ طلب کیا کہ بابو صاحب کو سر جھکا کر چلے آنے کے سوا کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے کی انھیں ہمت ہی کیوں کر ہو سکتی۔ ان کا حق الخدمت تو غالباً بابو صاحب کی نصف ملکیت بیع ہونے پر بھی نہ پورا ہوتا۔ آخر جب تین لڑکیوں کے بعد یہ چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو پھر وہی گودڑ تھا اور وہی گودڑ کی بہو۔ بچے بیشتر رات ہی کو پیدا ہوتے ہیں۔ چناں چہ آدھی رات کو بابو صاحب کے چپراسی نے گودڑ! گودڑ کی ہانک لگائی کہ چماروں کی ٹولی جاگ اُٹھی۔

گودڑ کے گھر میں اس روز سعید کی مہینوں سے تیاری تھی۔ خدشہ تھا تو یہی کہ کہیں بٹی نہ ہو جائے۔ نہیں تو پھر وہی بندھا ہوا ایک روپیہ اور وہی ایک ساڑی مل کر رہ جائے گی۔ اس مسئلہ پر میاں بیوی میں بارہا تبادلۂ خیالات ہو چکا تھا۔ شرطیں لگ چکی تھیں۔ گودڑ کی بہو کہتی تھی کہ اگر اب کے بیٹا نہ ہو تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں ہاں۔ منہ نہ دکھاؤں اور گودڑ کہتا تھا کہ دیکھو بیٹی ہوگی اور بیچ کھیت بیٹی ہوگی۔ بیٹا پیدا ہوا تو مونچھیں منڈوا لوں گا۔ شاید گودڑ سمجھتا تھا کہ اسی طرح بھنگی میں مخالفانہ جوش پیدا کر کے وہ بیٹے کی آمد کے لیے راستہ تیار کر رہا ہے۔

بھنگی بولی۔ ''اب منڈا لے مونچھیں ڈاڑھی جا۔ کہتی تھی بیٹا ہوگا، پر سُنے ہی نہیں۔ اپنی رٹ لگائے۔ کہ تیری مونچھیں مونڈوں گی۔ کھونٹی تو رکھوں نہیں۔''

گودڑ نے کہا۔ ''اچھا مونڈ لینا بھلی مانس۔ مونچھیں کیا پھر نکلیں گی ہی نہیں۔ تیسرے دن پھر دیکھے گی جوں کی توں ہیں۔ مگر جو کچھ ملے گا اس میں آدھا رکھ لوں گا۔ کہے دیتا ہوں۔''

بھنگی نے انگوٹھا دکھایا اور اپنے تین مہینے کے بچے کو گودڑ کے سپرد کر، سپاہی کے ساتھ چل دی۔

گودڑ نے پکارا۔ سن تو۔ کہاں بھاگی جاتی ہے؟ مجھے بھی تو روشن چوکی بجانے جانا پڑے گا۔''

بھنگی نے دور ہی سے کہا۔ ''تو کون بڑی مشکل ہے۔ وہیں دھرتی پر لٹا دینا اور روشن چوکی بجانا۔ میں آ کر دودھ پلا دیا کروں گی۔''

(۲)

مہیش ناتھ کے ہاں اب کے بھنگی کی خوب خاطر کی گئی۔ صبح کو حریرہ ملتا۔ دوپہر کو پوریاں اور حلوا۔ تیسرے پہر کو پھر اور رات کو پھر۔ اور گودڑ کو بھی بھرپور پروسا ملتا تھا۔ بھنگی اپنے بچے کو دن بھر میں دوبار سے زیادہ دودھ نہ پلا سکتی۔ اس کے لیے اوپر کا دودھ مہیا کر دیا جاتا۔ بھنگی کا دودھ بابو صاحب کا بچہ پیتا تھا اور یہ سلسلہ بارھویں دن بھی نہ بند ہوا۔ مالکن موئی تازی عورت تھیں، مگر اب کی کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ لڑکیوں کو بدہضمی ہو جاتی تھی۔ اب کی ایک بوند نہیں۔ بھنگی جنائی بھی تھی اور دودھ پلائی بھی۔

مالکن نے کہا۔ ''بھنگی ہمارے بچے کو پال دے۔ پھر جب تک جیئے بیٹھی کھاتی رہنا۔ پانچ بیگھے معافی دلوا دوں گی۔ تیرے پوتے تک کھائیں گے۔''

اور بھنگی کا لاڈلا اوپر کا دودھ نہ ہضم کر سکنے کے باعث بار بار تے کرتا اور روز بروز لاغر ہوتا جاتا تھا۔ بھنگی کہتی۔ ''اور مونڈن میں جوڑے لوں گی بہو جی! کہے دیتی ہیں۔''

بہو جی۔ ''ہاں ہاں جوڑے لینا بھائی۔ دھمکاتی کیوں ہے؟ چاندی کے لے گی یا سونے کے؟''

''واہ بہو جی واہ۔ چاندی کے جوڑے پہن کے کسے منہ دکھاؤں گی؟''

''اچھا سونے کے لینا بھائی! کہتی تو ہوں۔''

''اور بیاہ میں کنٹھا لوں گی۔ اور چودھری (گودڑ) کے لیے ہاتھوں کے توڑے۔''

بہو جی۔ ''وہ بھی لینا۔ وہ دن تو بھگوان دکھائیں۔''

گھر میں مالکن کے بعد بھنگی کی حکومت تھی۔ مہریاں، مہراجن، مزدورنیں، سب اس کا رُعب مانتی تھیں۔ یہاں تک کہ خود بہو جی اس سے دب جاتی تھیں۔ ایک بار تو اس نے مہیش ناتھ کو بھی ڈانٹا تھا۔ ہنس کر ٹال گئے۔ بات چلی تھی بھنگیوں کی۔ مہیش ناتھ نے کہا تھا۔'' دنیا میں اور چاہے جو کچھ ہو جائے، بھنگی بھنگی رہیں گے۔ انھیں آدمی بنانا مشکل ہے۔''

اس پر بھنگی نے کہا تھا۔'' مالک! بھنگی تو بڑے بڑوں کو آدمی بناتے ہیں۔ انھیں کیا کوئی آدمی بنائے گا؟''

یہ گستاخی کر کے کسی دوسرے موقعہ پر بھلا بھنگی سلامت رہتی۔ سر کے بال اُکھاڑ لیے جاتے لیکن آج بابو صاحب ہنسے۔ قہقہہ مار کر بولے۔

'' بھنگی بات بڑے پتے کی کہتی ہے۔''

(۳)

بھنگی کی حکومت سال بھر تک قائم رہی۔ پھر چھن گئی۔ بچے کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اب برہمنوں نے بھنگی کا دودھ پینے پر اعتراض کیا۔ موٹے رام شاستری تو پرائشچت کی تجویز کر بیٹھے۔ لیکن مہیش ناتھ احمق نہ تھے۔ پھنکار پلائی۔ پرائشچت کی خوب کہی آپ نے شاستری جی۔ کل تک اسی بھنگن کا خون پی کر پلا۔ اب پرائشچت کرنا چاہیے۔ واہ!''

شاستری جی بولے۔'' بے شک کل تک بھنگن کا خون پی کر پلا۔ گوشت کھا کر پلا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہو لیکن کل کی بات کل تھی آج کی بات آج ہے۔ جگن ناتھ پور میں تو چھوت اچھوت سب ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ مگر یہاں تو نہیں کھا سکتے۔ کھچڑی تک کھا لیتے ہیں بابو جی اور کیا کہیں؟ پوری تک نہیں رہ جاتے۔ لیکن اچھے ہو جانے پر تو نہیں کھا سکتے۔''

''تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دھرم بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔''

''اور کیا! راجہ کا دھرم الگ پرجا کا دھرم الگ، امیر کا دھرم الگ غریب کا دھرم الگ راجے مہاراجے جو چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں کھائیں، جس کے ساتھ چاہیں شادی بیاہ کریں۔ ان کے لیے کوئی قید نہیں۔ راجہ ہیں مگر ہمارے اور تمھارے لیے تو قدم قدم پر بندشیں ہیں۔ اس کا دھرم ہے۔'' پرائشچت تو نہ ہوا۔ لیکن بھنگی سے اس کی سلطنت چھینی گئی۔ برتن، کپڑے، اناج اتنی کثرت سے ملے کہ وہ اکیلی نہ لے جا سکی۔ اور سونے کے چوڑے بھی ملے اور ایک دونی اور خوب صورت

ساڑھیاں، معمولی نین سکھ کی نہیں جیسی لڑکیوں کی بار ملی تھیں۔

(۴)

اسی سال چیچک کا زور ہوا۔ گودڑ پہلے ہی زد میں آ گیا۔ بھنگی اکیلی رہ گئی مگر کام جوں کا توں چلتا رہا۔ بھنگی کے لیے گودڑ اتنا ضروری نہ تھا جتنا گودڑ کے لیے بھنگی۔ لوگ منتظر تھے کہ بھنگی اب گئی اب گئی۔ فلاں بھنگی سے بات چیت ہوئی۔ فلاں چودھری آئے لیکن بھنگی کہیں نہ گئی۔ یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے اور منگل دُبلا، کمزور اور دائم المریض رہنے پر بھی دوڑنے لگا۔ ماں کا دودھ نصیب ہی نہ ہوا۔ دائم المریض کیوں نہ ہوتا؟

ایک دن بھنگی مہیش ناتھ کے مکان کا پرنالہ صاف کر رہی تھی۔ مہینوں سے غلاظت جمع ہو گئی تھی۔ آنگن میں پانی بھرا رہنے لگا تھا۔ پرنالے میں ایک لمبا موٹا بانس ڈال کر زور سے ہلا رہی تھی۔ پورا داہنا ہاتھ پرنالے کے اندر تھا کہ یکا یک اس نے چلّا کر ہاتھ باہر نکال لیا اور اسی وقت ایک لمبا سا کالا سانپ پرنالے سے نکل کر بھاگا۔ لوگوں نے دوڑ کر اسے تو مار ڈالا لیکن بھنگی کو نہ بچا سکے۔ خیال تھا کہ پانی کا سانپ ہے، زیادہ زہریلا نہ ہوگا۔ اس لیے پہلے کچھ غفلت کی گئی۔ جب زہر جسم میں پیوست ہوا اور لہریں آنے لگیں تب پتہ چلا کہ پانی کا سانپ نہیں کالا سانپ تھا۔

منگل اب یتیم تھا۔ دن بھر مہیش بابو کے دروازے پر منڈلایا کرتا۔ گھر میں اتنا جھوٹا بچتا تھا کہ ایسے ایسے دس پانچ بچے سیر ہو سکتے تھے۔ منگل کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ ہاں دور ہی سے اسے مٹی کے ایک سکورے میں کھانا ڈال دیا جاتا اور گاؤں کے لڑکے اس سے دور دور رہتے تھے۔ یہ بات اسے اچھی نہ لگتی تھی۔ سب لوگ اچھے اچھے برتنوں میں کھاتے ہیں۔ اس کے لیے مٹی کے سکورے! یوں اسے اس تفریق کا مطلق احساس نہ ہوتا لیکن لڑکے اسے چڑھا چڑھا کر اس ذلت کے احساس کو سان پر چڑھاتے رہتے تھے۔ مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے منگل کا ڈیرا تھا۔ ایک پھٹا پھٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا، دو سکورے اور دھوتی جو مہیش بابو کے خوش نصیب فرزند سریش کے اتارے کپڑوں میں سے ایک تھی۔ جاڑا، گرمی، برسات، ہر موسم کے لیے وہ ایک سی آرام دہ تھی۔ یہی اس کی خصوصیت تھی اور سخت جان منگل جھلستی ہوئی لُو اور کڑاکے کے جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی زندہ تھا اور تندرست تھا۔ بس اس کا کوئی رفیق تھا تو گاؤں کا ایک کتا جو اپنے ہم چشموں کی بدمزاجیوں اور تنگ ظرفیوں سے عاجز آ کر منگل کے زیر سایہ آپڑا تھا۔ کھانا دونوں کا ایک تھا۔ کچھ طبیعت بھی یکساں تھی اور غالباً دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو گئے تھے۔

منگل نے اس کا نام رکھا تھا ٹامی۔ مگر ٹامی مہیش ناتھ کے انگریزی کتے کا نام تھا۔ اس لیے اس نام کا

استعمال وہ اسی وقت کرتا جب دونوں رات کو سونے لگتے۔

منگل کہتا۔ ''دیکھو ٹامی، ذرا اور کھسک کر سوؤ۔ آخر میں کہاں لیٹوں۔ سارا ٹاٹ تو تم نے گھیر لیا۔'' ٹامی ٗکوں ٗکوں کرتا اور دُم ہلاتا، بجائے اس کے کہ کھسک جائے اور اوپر چڑھ آتا اور منگل کا منہ چاٹنے لگتا۔ شام کو وہ ایک بار روز اپنا گھر دیکھنے اور تھوڑی دیر رونے جاتا۔ پہلے سال پھوس کا چھپر گرا۔ دوسرے سال ایک دیوار گری اور اب صرف آدھی آدھی دیواریں کھڑی تھیں، جن کا اوپر کا حصہ نوکدار ہو گیا تھا۔ یہیں اسے محبت کی دولت ملی تھی۔ وہی مزا، وہی یاد، وہی کشش اسے ایک بار ہر روز اس ویرانے میں کھینچ لے جاتی اور ٹامی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کھنڈر کی مخروطی دیوار پر بیٹھ جاتا اور زندگی کے آنے والے اور گزشتہ خواب دیکھنے لگتا۔ اور ٹامی دیوار پر کود جانے کی بار بار ناکام کوشش کرتا۔

(۵)

ایک دن کئی لڑکے کھیل رہے تھے۔ منگل بھی پہنچ کر دور کھڑا ہو گیا۔ سریش کو اس پر رحم آیا۔ کھیلنے والوں کی جوڑی پوری نہ پڑتی تھی۔ کچھ بھی ہو، اس نے تجویز کی، کہ آج منگل کو بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے۔ یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔

سریش نے منگل سے پوچھا۔ ''کیوں رے کھیلے گا؟''

منگل بولا۔ ''کھلاؤ گے تو کیوں نہ کھیلوں گا۔''

سریش نے کہا۔ ''اچھا تو ہم تینوں سوار بنتے ہیں۔ تم ٹٹو بن جاؤ۔ پھر ہم لوگ تمھارے اوپر سوار ہو کر گھوڑا دوڑائیں گے۔''

منگل نے پوچھا۔ ''میں برابر گھوڑا ہی رہوں گا کہ سواری بھی کروں گا۔''

یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ سریش نے ایک لمحہ غور کر کے کہا۔ ''تجھے کون اپنی پیٹھ پر بٹھائے گا۔ سوچ آخر تو بھنگی ہے کہ نہیں؟''

منگل نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا۔ ''میں کب کہتا ہوں کہ میں بھنگی نہیں ہوں۔ لیکن جب تک مجھے بھی سواری کرنے کو نہ ملے گی گھوڑا نہ بنوں گا۔ تم لوگ سوار بنو گے اور میں گھوڑا ہی بنا رہوں گا؟''

سریش نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ ''تجھے تو گھوڑا بننا پڑے گا۔'' اس نے منگل کو پکڑنا چاہا۔ منگل بھاگا۔ سریش بھی دوڑا۔ منگل نے قدم اور تیز کیا۔ سریش نے بھی زور لگایا مگر بسیار خوری نے اسے تھل تھل

بنا دیا تھا اور دوڑنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ آخر سریش نے رُک کر کہا۔ ''آ کر گھوڑا بنو منگل۔ ورنہ کبھی پاؤں گا تو بری طرح پیٹوں گا۔''

''تمھیں بھی گھوڑا بننا پڑے گا۔''

''اچھا ہم بھی بن جائیں گے۔''

''تم بعد میں بھاگ جاؤ گے۔ اس لیے پہلے تم بن جاؤ۔ میں سواری کرلوں۔ پھر میں بنوں گا۔''

سریش نے چکمہ دیا۔ منگل کے اس مطالبہ نے برہم کر دیا۔ ساتھیوں سے بولا۔

''دیکھو اس کی بدمعاشی! بھنگی ہے۔'' تینوں نے اب کی منگل کو گھیر لیا اور زبردستی گھوڑا بنا دیا۔ سریش اپنا وزنی جسم لے کر اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور ٹک ٹک کر کے بولا۔ ''چل گھوڑے چل۔'' مگر اس بوجھ کے نیچے غریب منگل کے لیے ہلنا بھی مشکل تھا۔ دوڑنا تو دور کی بات تھی۔ ایک لمحہ تو وہ ضبط کیے چوپایہ بنا کھڑا رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے پیٹھ سکوڑی اور سریش کی ران کے نیچے سے سرک گیا۔ سریش گد سے گر پڑا اور بھونپو بجانے لگا۔ ماں نے سنا سریش کیوں رو رہا ہے؟ گاؤں میں کہیں سریش روئے اُن کے ذکی الحس کانوں میں ضرور آواز آ جاتی تھی اور اس کا رونا تھا بھی دوسرے لڑکوں سے بالکل نرالا جیسے چھوٹی لائن کے انجن کی آواز۔

ایک منٹ میں سریش آنکھیں ملتا ہوا گھر میں آیا۔ آپ کو جب کبھی رونے کا اتفاق ہوتا تھا تو گھر میں فریاد لے کر ضرور آتے تھے۔ ماں چپ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ دے دیتی تھی۔ آپ تھے تو آٹھ سال کے، مگر بہت بے وقوف، حد سے زیادہ پیارے۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیوں رو رہا ہے سریش؟ کس نے مارا؟'' سریش نے روتے ہوئے کہا۔ ''منگل نے چھوا دیا۔''

پہلے تو ماں کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب سریش قسمیں کھانے لگا تو یقین لانا لازم ہو گیا۔ اُس نے منگل کو بلوایا اور ڈانٹ کر بولی۔ ''کیوں رے منگلوا۔ اب تجھے بدمعاشی سوجھنے لگی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ سریش کو چھونا نہیں۔ یاد ہے کہ نہیں؟ بول۔'' منگل نے دبی آواز سے کہا ''یاد ہے۔''

''تو پھر تو نے اسے کیوں چھوا؟..... تو نے نہیں چھوا تو یہ روتا کیوں تھا؟''

''یہ گر پڑے اس لیے رونے لگے۔''

''چوری اور سینہ زوری۔'' دیوی دانت پیس کر رہ گئیں۔ مارتیں تو اسی وقت اشنان کرنا پڑتا۔ قمچی تو

ہاتھ میں لینا ہی پڑتی اور چھوت کی برقی رَو تچی کے راستہ ان کے جسم میں سرایت کر جاتی، اس لیے جہاں تک گالیاں دے سکیں، دیں اور حکم دیا کہ ''اسی وقت یہاں سے نکل جا۔ پھر جو تیری صورت نظر آئی تو خون ہی پی جاؤں گی۔ مفت کی روٹیاں کھا کھا کر شرارت سوجھتی ہے۔

منگل میں غیرت تو کیا ہوگی خوف تھا۔ چپکے سے اپنے سکورے اُٹھائے، ٹاٹ کا ٹکڑا بغل میں دبایا، دھوتی کندھے پر رکھی اور روتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ یہی تو ہوگا کہ بھوکوں مر جائے گا۔ کیا حرج ہے، اس طرح جینے سے فائدہ ہی کیا؟ گاؤں میں اور کہاں جاتا۔ بھنگی کو کون پناہ دیتا۔ وہی اپنے بے در و دیوار کی آڑ تھی، جہاں پچھلے دنوں کی یادیں اس کے آنسو پونچھ سکتی تھیں۔ وہیں جا کر پڑ رہا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹامی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا۔

(۲)

لیکن جوں جوں شام ہوتی گئی، اس کا احساس ذلت بھی غائب ہوتا گیا۔ بچپن کی بیتاب کرنے والی بھوک جسم کا خون پی پی کر اور بھی بے پناہ ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں بار بار سکوروں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اس نے مشورتاً ٹامی سے کہا۔ ''کھاؤ گے کیا؟ میں تو بھوکا ہی لیٹ رہوں گا۔ ٹامی نے کوں کوں کر کے شاید کہا۔ ''اس طرح کی ذلتیں تو ساری زندگی سہنی ہیں۔'' پھر ذرا دیر کے بعد دُم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ ہماری زندگی اسی کے لیے ہے بھائی۔

منگل بولا۔ ''تم جاؤ جو کچھ مل جائے کھالو۔ میری پروا نہ کرو۔'' ٹامی نے پھر اپنی سگستانی بولی میں کہا۔ ''اکیلا نہیں جاتا۔ تمھیں ساتھ لے کر چلوں گا۔'' ایک لمحہ بعد بھوک نے تالیف کا ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ ''مالکن تلاش کر رہی ہوں گی۔ کیوں ٹامی۔'' اور کیا بابو جی اور سریش کھا چکے ہوں گے؟ کہار نے ان کی تھالی کا جھوٹا نکال لیا ہوگا اور ہمیں پکار رہا ہوگا۔'' ''بابو جی اور سریش دونوں کی تھالیوں میں گھی اور وہ میٹھی میٹھی چیز۔ ہاں ملائی۔ ہماری آواز نہ سنائے دے گی تو سب کا سب گھورے پر ڈال دیں گے۔ ذرا دیکھ لیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے آتا ہے۔'' ''یہاں کون پوچھنے آئے گا۔ کوئی برہمن ہو۔''

''اچھا تو چلو وہیں چلیں مگر چھپے ہوئے رہیں گے۔ اگر کسی نے نہ پکارا تو میں لوٹ آؤں گا، یہ سمجھ لو۔''

دونوں وہاں سے نکلے اور آ کر مہیش ناتھ کے دروازے پر ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔

ٹامی شاید ادھر اُدھر کی خبر لانے چلا گیا۔ مبیش بابو تھالی پر بیٹھ گئے تھے۔ نوکر آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''آج منگلو نہیں دکھائی دیتا۔ بھوکا ہوگا بیچارا۔ مالکن نے ڈانٹا تھا، اسی لیے بھاگا ہے شاید۔'' منگل کے جی میں آیا چل کر اس آدمی کے قدموں پر گر پڑے۔ دوسرے نے جواب دیا۔ ''اچھا ہوا نکالا گیا نہیں تو سویرے سیرے بھنگی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔'' منگل اور اندھیرے میں کھسک گیا۔ اب کیا امید کی جا سکتی تھی۔ مبیش اور سریش تھالی سے اُٹھ گئے۔ نوکر ہاتھ منہ دھلا رہا ہے۔ اب بابو جی حقہ پئیں گے۔ سریش سوئے گا۔ غریب منگل کی کسے فکر ہے۔ اتنی دیر ہوگئی کسی نے نہیں پکارا۔ کون پکارے گا۔ منگل آدھ گھنٹے تک وہیں دبکا رہا۔ کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسی کہار کو ایک تھالی میں جھوٹا کھانا لے جاتے دیکھا۔ شاید گھورے پر ڈالنے جا رہا تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔ اب صبر نہ ہو سکتا تھا۔ کہار نے کہا۔ ''ارے تو یہاں تھا۔ ہم نے کہا کہیں چلا گیا لے کھا لے۔ میں پھینکنے لے جا رہا تھا۔'' منگل نے کہا۔ ''میں تو بڑی دیر سے یہاں کھڑا تھا۔'' کہار نے کہا ''تو بولا کیوں نہیں؟'' منگل بولا۔ ''ڈر لگتا تھا۔''

منگل نے کہار کے ہاتھ سے تھال لے لیا اور اسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں شکر اور احسان مندی کی ایک دنیا چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں نیم کے درخت کے نیچے حسبِ معمول کھانے لگے۔ منگل نے ایک ہاتھ سے ٹامی کا سر سہلا کر کہا۔ ''دیکھا پیٹ کی آگ ایسی ہوتی ہے۔ لات کی ماری ہوئی روٹیاں بھی نہ ملتیں تو کیا کرتے۔'' ٹامی نے دُم ہلائی۔ ''سریش کو اماں ہی نے پالا ہے ٹامی۔'' ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔ ''اور مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے۔'' ٹامی نے پھر دُم ہلا دی۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' کے جولائی ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سرور' نمبر-۲ میں شامل ہے۔ اردو میں اسی نام کے مجموعہ میں شامل ہے۔)

بڑے بھائی صاحب

(1)

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے لیکن صرف تین درجے آگے۔ اُنھوں نے اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا، جب میں نے شروع کیا۔ لیکن تعلیم جیسے اہم معاملہ میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد پختہ خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا وہ بڑے تھے، میری عمر نو سال تھی، وہ چودہ سال کے تھے، انھیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اس میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے۔ ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر، کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے۔ کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار لکھ جاتے، کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوشخط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط ہوتا نہ کوئی معنی۔ مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں، میں نے عبارت دیکھی، اسپیشل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں، دراصل بھائی بھن رادھے شیام، شری جت رادھے شیام۔ ایک گھنٹے تک، اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں، لیکن ناکام رہا اور ان سے پوچھنے کی ہمّت نہ پڑی۔ وہ نویں جماعت میں تھے، میں پانچویں جماعت میں، ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا، ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بار خاطر تھا۔ موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آجاتا اور کبھی کنکریاں اُچھالتا، کبھی کاغذ کی تیلیاں اڑاتا اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا، کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر نیچے کود رہے ہیں۔ کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اُٹھا رہے ہیں، لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا

مزا کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا، کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا، نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعترافِ گناہ سمجھی جاتی اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے ہوئے لہجہ میں کہتے، اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ جو چاہے پڑھ لے، اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے تب جا کر کہیں انگریزی آتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ تم کتنے کور مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے۔ میں کتنی محنت کرتا ہوں، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمھارا قصور ہے، تمھاری عقل کا قصور ہے۔ اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں۔ میں کبھی نہیں جاتا، روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں میں قریب نہیں پھٹکتا۔ ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں، اس پر بھی دو دو تین تین سال ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں، پھر تم کیسے اُمید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں۔ تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے سڑتے رہو گے۔ اگر تمھیں اس طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلّی ڈنڈا کھیلو، دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا۔ بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا۔ ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی، اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی آ جاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں، جو کام میرے بوتے کے باہر ہے، اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا، ٹائم ٹیبل بناتا، صبح اُٹھنا، منہ دھو کر ناشتہ کرنا، پھر انگریزی مطالعہ سات سے آٹھ تک، حساب آٹھ سے نو تک، تاریخ نو سے ساڑھے نو تک، کھانا کھا کر اسکول جانا، ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس آدھ گھنٹے تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر، آدھ گھنٹہ آرام، چھ سے ساڑھے سات تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی، نو سے دس تک اردو، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔

مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی، اس پر عمل کرنا دوسری بات، پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی، میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دل آویز ہریالی، وہ پُر لطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت کرنے کا موقع مل جاتا، میں ان کے سایہ سے بھاگتا۔ ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا، کمرہ میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ

انھیں خبر نہ ہو، ان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہوئی، ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی، کتابوں سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

(2)

سالانہ امتحان ہوا، بھائی صاحب فیل ہو گئے، میں پاس ہو گیا اور درجہ میں اوّل آیا۔ میرے اور اُن کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت ہو گیا۔ جی میں آیا، بھائی صاحب کو آڑے ہاتھ لوں۔ آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی، مجھے دیکھیے مزے سے کھیلتا بھی رہا اور درجہ میں اوّل ہوں، لیکن وہ اس قدر پژمردہ شکستہ خاطر تھے کہ مجھے اُن سے دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا، ہاں اب مجھے خود پر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا، آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا۔ اگر انھوں نے پھر نصیحت کی تو صاف کہہ دوں گا۔ آپ نے اپنا خون جلا کر کون سا تیر مار لیا۔ میں تو کھیلتے کودتے درجہ میں اوّل آ گیا۔ زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں۔ بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلّی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجہ اوّل میں آ گئے تو اب تمھیں دماغ ہو گیا ہے مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا، تمھاری کیا ہستی ہے۔ تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہوگا۔ اس کی زندگی سے تم نے آخر کیا نتیجہ نکالا۔ یوں ہی بڑھ گئے۔ محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں، اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا۔ راون ساری دنیا کا مہاراجہ تھا۔ ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انھیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے۔ راون چکرورتی راجہ تھا۔ بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے، آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے، مگر اس کا انجام کیا ہوا۔ غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ کوئی اسے ایک چلّو پانی دینے والا تک نہ بچا۔ انسان اور جا ہے جو برائی کرے غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہوگا۔ اسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں ڈھکیل دیا گیا۔ شاہ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا۔ بھیک مانگ مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا اور ابھی سے تمھارا سر پھر گیا، تب تو تم آگے بڑھ چکے، یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے، اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی۔ مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی کبھی گلّی ڈنڈے میں بھی اندھے کا چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب

کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ۔ میرے درجے میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آ جائے گا۔ جب الجبرا اور جیمیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی۔ بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان نہیں، آٹھ آٹھ ہنری ہو کر گزرے ہیں، کون سا واقعہ کس ہنری کے زمانہ میں ہوا، کیا اسے یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو۔ ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب، صفر بھی نہ ملے گا، صفر بھی! ہو کس خیال میں، درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے، ان کم بختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے۔ ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ! اب ج کی جگہ اج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ گئے۔ کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر اب ج اور اج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے لیے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کون سا فرق ہے۔ مگر ممتحنوں کو کیا پرواہ۔ وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹو ہو جائیں۔ اسی رٹ کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا، اس خطہ پر دو عموماً گرا دو تو قاعدہ عمود سے دوگنا ہوگا۔ پوچھیے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائے، آٹھ گنا ہو جائے میری بلا سے، لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھتے پڑھتے ہیں، کہہ دیا۔ "وقت کی پابندی" پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو، اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھیے؟ جو بات ایک جملے میں کہی جا سکے، اس کے لیے چار صفحے لکھنے پڑیں گے، چاہے جیسے لکھیے اور صفحے بھی پورے فل اسکیپ سائز کے، یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں ہے تو کیا ہے؟ ظالم اس پر بھی یہ کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو۔ تیز بھی دوڑیے اور آہستہ بھی، ہے متضاد یا نہیں۔ بچہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں، اس پر دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں میرے درجہ آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اس درجہ میں اوّل آ گئے تو اتنا اتراتے ہو، میرا کہنا مانو، لاکھ فیل ہو گیا لیکن تم سے بڑا ہوں۔ دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے۔ میرا کہنا مانو۔ جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو، ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا، ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی، مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ انھوں نے اپنے درجہ کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا، کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا، یہی تعجب ہے، لیکن سب درگت ہونے پر بھی کتابوں

سے میری بیزاری بدستور قائم رہی۔ کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا، مگر بہت کم، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(3)

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بے چارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے۔ میں نے محنت زیادہ نہیں کی، مگر خدا جانے کیسے درجہ میں اوّل آ گیا۔ مجھے خود تعجب ہوا۔ بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی، دس بجے رات تک، ادھر چار بجے صبح سے، پھر اُدھر چھ بجے سے ساڑھے نو تک۔ اسکول جانے کے قبل۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا مگر فیل۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے اور میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا تھا۔ میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں، پھر کس بنا پر میری نصیحت کر سکیں گے۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری بھلائی کے لیے، مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے ضرور، مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنادن پاس ہوتا جاؤں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے، کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی اُنھوں نے تحمل سے کام لیا، شاید اب انھیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انھیں نہیں رہا، یا رہا تو بہت کم۔ میری بدمعاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اُٹھانے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا، پڑھوں یا نہ پڑھوں، میری تقدیر اچھی ہے۔ اس لیے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑی بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اُڑاتا تھا، ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں، میں انھیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی، شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے۔ اُنھوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے، ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے

دوڑتے تمھیں شرم نہیں آتی، تمھیں اس کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو، بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو، آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے تحصیل دار ہو جاتے تھے، میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اوّل درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں۔ بی اے اور ایم اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیروں ہیں اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آ کر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑتے ہو۔ افسوس ہے تمھاری اس ناعقلی پر تم ذہین ہو، اس میں شک نہیں لیکن وہ ذہن کس کام کی جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انھیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمھارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور چاہے آج تم میری ہی جماعت میں آ جاؤ اور ممتحنوں کا یہی حال رہا تو یقیناً اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے۔ اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ بڑا رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر کبھی نہیں آ سکو گے، چاہے تم ایم۔ اے اور ایل ایل ڈی ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ عقل کتابیں پڑھ لینے ہی سے نہیں آتی۔ ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں، یہ باتیں انھیں نہ معلوم ہوں، لیکن تمھاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ پہلے خود مرض پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ گھبرائیں گے نہیں، بدحواس نہ ہوں گے۔ ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں لیکن جتنا آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور ایک کنبہ کی پرورش کی ہے جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم قریب آ گئے اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کرنے پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمھیں میری بات زہر لگ رہی ہے۔

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہوکر بہ چشم نم کہا ''ہرگز نہیں۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔''

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگالیا اور بولے ''میں کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا، میرا جی بھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے۔ کروں گا خود بے رہ چلوں گا تو تمھیں ہدایت کیسے کروں، یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔''

اتفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا، اس کی ڈور لٹک رہی تھی۔ بھائی صاحب لمبے تھے، اُچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی اور اسے لیے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے، میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

(یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی 'ہنس' کے نومبر ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'مان سرور نمبر-۲' میں شامل ہے۔ اردو میں 'زادِ راہ' میں شامل ہے۔)

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔

مادھو دردناک لہجہ میں بولا۔ مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔''

''تو بڑا بے درد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ ہی اتنی بیوپھائی۔''

''تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو پھر چلم پیتا۔ اس لیے انھیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا۔ اور جب تک دو پیسے رہتے دونوں ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشت کاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کی فکروں سے

آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اُکھاڑ لاتے اور بھون کر کھالیتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اُس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر، وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی، یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ ''جا کر دیکھ تو۔ کیا حالت ہے اُس کی۔ چڑیل کا پھساد ہو گا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا ''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا ہے میں تو یہاں ہوں ہی۔''

''تو تمھیں جا کر دیکھو نا۔''

''میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اُس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اُس کا منہ نہیں دیکھا۔ آج اس کا اُگھرا ہوا بدن دیکھوں، اسے تن کی سُدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔''

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ، گڑ، تیل، کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔''

''سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بُلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔''

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت اُن کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے، وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلہ میں زیادہ باریک بیں تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مُکھیا بنے ہوئے تھے، اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا، پھر بھی اُسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اُٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصّہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصّہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھے، اس لیے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالاں کہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اُس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اُسے جو سیری نصیب ہوئی تھی، وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اُس کی یاد تازہ تھی۔ بولا وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں سب کو۔ چھوٹے بڑے، سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا، کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول، مہکتی ہوئی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں، منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے۔ پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ دیے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک بیڑا پان بھی ملا، مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔''

''اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے! بٹورنے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔''

''تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی!''

''بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔''

''میں پچاس کھا جاتا۔''

''پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اُس کا آدھا بھی نہیں ہے۔'' آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے، جیسے دو بڑے بڑے گینڈلیاں مارے پڑے ہوں۔

اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(2)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اُس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسمِ قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا۔ کیا ہے گھسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نہیں

نظر آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ ’’سرکار، بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ آپ مُدا وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا، مالک تباہ ہو گئے۔ گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اُٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اُٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں ’’چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بُلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے، حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش۔‘‘ مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اُتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیے، کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹہ میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلّہ دے دیا، کسی نے لکڑی اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آ آ کر لاش دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(3)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ ’’لکڑی تو اُسے جلانے بھر کو مل گئی ہے۔ کیوں مادھو۔‘‘

مادھو بولا۔ ’’ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہیے۔‘‘

’’تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔‘‘

’’ہاں اور کیا۔ لاش اُٹھتے اُٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔‘‘

’’کیسا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن

چاہیے۔''

''کفن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک۔ اور دونوں برانڈہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کُجیاں پیم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا۔ ''کفن لگانے سے کیا ملتا۔ آ کھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔''

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ برہمنوں کو ہجاروں روپے کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھینکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔''

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے! لوگ پوچھیں گے نہیں کفن کہاں ہے!''

گھیسو ہنسا۔ کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔

مادھو بھی ہنسا اس غیر متوقعہ خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر۔ بولا۔ بڑی اچھی تھی، بچاری، مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں، گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اُڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو اُنھوں نے بہت پہلے طے کرلیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ''ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہوگا؟''

مادھو نے سرِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ جرور سے جرور ہو گا۔ بھگوان، تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اُسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اُسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا۔ ''کیوں دادا، ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی۔''

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

''جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمھارا سر۔''

''پوچھے گی تو جرور۔''

''میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اُس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔''

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ ون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیے؟''

گھیسو تیز ہو گیا۔ ''میں کہتا ہوں اُسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟''

''کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں؟''

''وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانے کی رونق بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لیے، شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہوکر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا اِن کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ''دینے'' کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ ''لے جا۔ کھوب کھا اسیر باد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مرگئی مگر تیرا اسیر باد اُسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بیکنٹھ میں جائے گی دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔

گھیسو کھڑا ہوگیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ '' ہاں بیٹا، بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں۔ کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے مرتے ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کرگئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا۔ ''مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔''

گھیسو نے سمجھایا۔ ''کیوں روتا ہے بیٹا۔ کُھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہوگئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔''

اور دونوں وہیں کھڑے ہوکر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نینا جھمکاوے۔ ٹھگنی۔

سارا میخانہ محوِ تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اُچھلے بھی، کودے بھی، مٹکے بھی۔ بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہوکر وہیں گر پڑے۔

(یہ افسانہ دلّی کے رسالہ 'جامعہ' کے دسمبر ۱۹۳۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ کسی اردو کے مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ ہندی میں اسی نام کے مجموعے میں شامل ہے۔)

پریم چند کا سوانحی خاکہ

پریم چند کا جنم ۳۱ رجولائی ۱۸۸۰ء کو ضلع بنارس (وارانسی) کے ایک گاؤں لمہی (موضع منڈھوا، پانڈے پور) میں ہوا۔ ان کے والد عجائب لال ڈاک خانے میں ملازم تھے اور ان کا تعلق ایک کائستھ خاندان سے تھا۔ پریم چند کا نام دھنپت رائے رکھا گیا۔ ابھی وہ آٹھ برس کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ عجائب لال نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کا برتاؤ پریم چند کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ والد نے ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی ایک مولوی کی نگرانی میں کر دیا، جن سے پریم چند نے کچھ عربی اور فارسی پڑھی۔ پھر ان کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہوا تو وہ ایک اسکول میں داخل کرا دیے گئے۔ پریم چند نے خاصی مشکلوں بھری زندگی کے باوجود اپنی تعلیم جاری رکھی۔ انیس برس کی عمر میں وہ نائب مدرس بنا دیے گئے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد پہلے تو وہ یو۔ پی کے مختلف اسکولوں میں پڑھانے کا کام کرتے رہے، پھر ۱۹۰۹ء میں سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز کے منصب پر فائز کر دیے گئے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق برقرار تھا۔ لہٰذا ملازمت کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ادب کی دنیا سے بھی تعلق قائم رکھا۔ 'زمانہ' کان پور اور اس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم سے پریم چند کے خصوصی مراسم تھے۔

پریم چند اپنی پہلی شادی سے مطمئن نہ تھے۔ ایک بال ودھوا شیورانی دیوی سے پریم چند نے دوسری شادی کر لی۔ شیورانی دیوی نے کچھ گھریلو تعلیم بھی پائی تھی۔ مزاجاً بہت سمجھ دار خاتون تھیں۔ وہی پریم چند کے بچوں کی ماں بنیں اور پریم چند کی دل چسپیوں میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے پریم چند کی زندگی پر خاصا گہرا اثر بھی ڈالا۔ پریم چند کی شخصیت پر دوسرا سب سے بڑا اثر گاندھی جی کا پڑا۔ گاندھی جی کی شخصیت، اُن کے آدرش واد اور سودیشی تحریک سے پریم چند اس حد تک متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ مختلف اوقات میں کئی رسالے نکالے۔ سب سے زیادہ شہرت ان میں 'ہنس' کو ملی جو پریم چند کی موت کے بعد بھی جاری رہا۔ یہ رسالہ ان کی یاد میں اب بھی نکل رہا ہے اور اس وقت اس کے مدیر ہندی کے معروف ادیب

اور سماجی کارکن راجندر یادو ہیں۔

قسمت آزمائی کے لیے پریم چند نے بمبئی کی فلمی دنیا کا رخ بھی کیا۔ لیکن یہ دنیا پریم چند کے مزاج اور اُن کے آدرشوں کے مطابق نہ تھی۔ یوں بھی، ان کی سیدھی سادی شخصیت، کاروباری مقاصد اور معاملات سے کسی طرح کی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ چناں چہ بمبئی سے پریم چند ناکام واپس آئے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (منعقدہ ۱۵/اپریل ۱۹۳۶ء) کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اپنے عہد کے روشن خیال لکھنے والوں کے لیے پریم چند کی حیثیت ایک رول ماڈل کی تھی۔ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں پریم چند کے خطبۂ صدارت کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔ اس خطبے کو اردو کی ادبی روایت کے فکری سیاق میں ایک غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اور ہم اسے اپنی روایت کے ارتقا میں ایک سنگ میل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے دوران، جدید نظم کی تحریک کے زیرِ اثر انجمن پنجاب کے مناظمے میں، جو رول محمد حسین آزاد کے لیکچر (۱۸۷۴ء) 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات' نے ادا کیا، اس سے زیادہ گہرا، دیرپا اور بامعنی رول ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (۱۹۳۶ء) میں پریم چند کے خطبۂ صدارت کا رہا ہے۔

پریم چند کا انتقال ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہوا۔

اپنی صرف چھپن برسوں کی، آزمائشوں اور طرح طرح کی خانگی اور اجتماعی الجھنوں سے بھری ہوئی زندگی میں، پریم چند نے تقریباً سوا تین سو کہانیاں لکھیں۔ 'مان سرووَر' کے نام سے آٹھ جلدوں میں پریم چند کی کہانیاں ہندی رسم الخط میں ان کے سامنے شائع ہو گئی تھیں۔ کہانیوں کے علاوہ پریم چند نے سماجی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی موضوعات پر مضامین، تبصروں، تجزیوں، اداریوں، رپورٹوں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ بھی اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ ڈرامے، فلمی کہانیاں، ناول، ترجمے اس کے علاوہ ہیں۔ پریم چند کے بیٹے امرت رائے نے پریم چند کی باقی ماندہ کہانیاں دو جلدوں میں، 'گپت دھن' کے عنوان سے، ان کے انتقال کے بعد شائع کیں۔

پریم چند کی زندگی اور سوانح پر سب سے وقیع کام ڈاکٹر رام بلاس شرما اور پریم چند کے بیٹے امرت

رائے نے کیا ہے۔ ڈاکٹر شرما کی کتاب ''پریم چند اور ان کا یگ'' کے نام سے اور امرت رائے کی کتاب ''قلم کا سپاہی'' کے نام سے معروف ہیں۔ ہندی اور اردو میں پریم چند کی شخصیت، سوانح، افکار، ان کے فن اور ادبی خدمات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ اب بھی زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔ راجندر یادو کا خیال ہے کہ پریم چند پر کام کرنے والے ابھی تک اندھی گلیوں میں بھٹک رہے ہیں اور اپنی کوتاہ بینی کے باعث پریم چند کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ہماری معاشرتی زندگی کے مسائل پریم چند کے بعد بھی، اپنی نوعیت کے لحاظ سے زیادہ تبدیل نہیں ہوئے ہیں اور ایسی بہت سی خرابیاں ہندوستانی سماج میں آج بھی موجود ہیں، جن کے خلاف پریم چند زندگی بھر جہاد کرتے رہے۔ اسی لیے، پریم چند کے نام پر کچھ لوگوں نے علم و ادب کے مطالعے کو بھی ایک انڈسٹری کی شکل دے دی ہے۔ پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں پر فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے قابلِ قدر خدمت ستیہ جیت رے نے انجام دی ہے۔ ان کی فلمیں 'شطرنج کے کھلاڑی' اور پریم چند کی دوسری کہانی 'نجات' پر بننے والی فلم (سدگتی) آرٹ اور فلم کی جمالیات کے بہت قیمتی نمونے ہیں۔ پریم چند کے مطالعات کے مراکز اور مختلف اداروں میں پریم چند پر تحقیقی اور تجزیاتی سرگرمیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان نے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ پریم چند کی زندگی میں ان کی کہانیاں اور ناول اردو اور ہندی میں آگے پیچھے شائع ہوتے رہے۔ کچھ چیزیں اردو میں پہلے چھپیں، کچھ ہندی میں چھپنے کے بعد اردو والوں تک پہنچیں۔ یوں، پریم چند نے اپنے آپ کو، بنیادی طور پر، اردو کا ہی ادیب سمجھا اور یہی زبان ان کے لیے ان کے فطری اظہار کا ذریعہ بنی رہی۔ لیکن علمی اور تحقیقی نوعیت کا کام ان کے بارے میں اردو سے بہتر ہندی والوں نے کیا ہے۔ اس کام کی رفتار اردو کی بہ نسبت ہندی میں آج بھی تیز تر ہے۔

ہمارے لیے اطمینان بخش بات یہ ہے کہ پریم چند کے سلسلے میں تعصبات بتدریج کم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے مجموعی رول پر نئے سرے سے سوچ بچار کا سلسلہ جاری ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی اب پریم چند کو اردو افسانے کے ایک اولین معمار کی حیثیت سے دیکھنے کا میلان عام ہو رہا ہے۔ شیورانی دیوی کی کتاب ''پریم چند گھر میں'' کا اردو ترجمہ حسن منظر نے کیا ہے۔ ان کے بارے میں علمی نوعیت کا کام مرزا حامد بیگ کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی کیا ہے۔ ابھی حال میں ڈاکٹر انوار احمد کی تالیف ''پریم چند کی بیس کہانیاں'' منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں پریم چند کے ایک نمائندہ انتخاب کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و فن کا جائزہ اور ایک مختصر سوانحی اشاریہ بھی

شامل ہے۔ اس اشاریے کے مطابق ان کے پہلے مجموعے ''سوزِ وطن'' (اشاعت ۱۹۰۸ء) سے لے کر پریم چند کے سالِ وفات (۱۹۳۶ء) تک، ان کی کہانیوں پر مشتمل نو کتابیں شائع ہوئیں۔۔ 'پریم پچیسی' حصہ اوّل (۱۹۱۵ء) اور حصۂ دوم (۱۹۱۸ء)، 'پریم بتیسی حصۂ اوّل (۱۹۲۰ء) اور حصہ 'دوم، 'خاک پروانہ (۱۹۲۸ء)، 'خواب و خیال' (۱۹۲۸ء)، فردوسِ خیال (۱۹۲۹ء)، پریم چالیسی، حصۂ اوّل (۱۹۳۰ء) اور دوم، آخری تحفہ (۱۹۳۴ء) اور 'زادِ راہ' (۱۹۳۶ء) پریم چند کے انتقال کے بعد ایک اور مجموعہ 'دودھ کی قیمت' (۱۹۳۷ء) کے نام سے اور دوسرا 'واردات' (۱۹۳۷ء) کے نام سے شائع ہوا۔ ان تمام کتابوں میں شامل کہانیوں کی مجموعی تعداد ایک سونوے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے کلیات کی جو جلدیں مدن گوپال کی نگرانی میں شائع ہوئی ہیں، ان کا ماخذ، ہندی کے معروف فکشن نگار اور پریم چند اسٹڈیز سے خصوصی دل چسپی رکھنے والے، ڈاکٹر عبدل بسم اللہ کے خیال میں صرف 'مان سرووَر' کی آٹھ جلدیں ہیں، جو پریم چند کی زندگی کے دوران ہندی میں چھپ چکی تھیں۔

''مان سرووَر'' کے بعد امرت رائے کی مرتبہ ''گپت دھن'' کی دو جلدوں میں بقیہ کہانیاں آگئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ادھورا ہے۔ مگر یہ تلاش بھی ابھی جاری ہے اور پریم چند کے ۱۲۵ویں یومِ پیدائش کی تقریبات کے ساتھ اس سرگرمی میں تیزی آئی ہے۔

برصغیر ہندوستان اور پاکستان کی اجتماعی زندگی کے عام مسئلوں کا ادراک، جن خطوط پر عام ہو رہا ہے، اس کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ پریم چند کے فن اور افکار کو ہم اپنی مشترکہ تاریخ کے سیاق میں نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ پریم چند کی معنویت، اسی پس منظر میں ہماری حسیت سے ایک نیا رشتہ استوار کرتی ہے اور ان کی وراثت ہمارے لیے ایک نئی قدر و قیمت اختیار کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین سے کہانی کا رشتہ دائمی اور اٹوٹ ہے۔ اس رشتے کا عرفان جتنا عام ہوگا، پریم چند کی اہمیت کے احساس میں بھی، اسی تناسب سے، تیزی اور مضبوطی آتی جائے گی۔

پریم چند کے منتخب افسانے

(بڑے گھر کی بیٹی سے کفن تک)

پریم چند کی تقریباً سوا تین سو کہانیوں میں سے پندرہ کہانیوں کا یہ انتخاب ہمیں پریم چند کے شعور کی مختلف سطحوں اور درجات سے روشناس کراتا ہے۔ انھوں نے اپنی مختصر زندگی میں، عملی زندگی کے ابتدائی چند برسوں کو چھوڑ کر، جو ان کے لیے شدید ذہنی اور مالی دشواریوں کا دور تھا اور وہ یکسوئی کے ساتھ لکھنے پڑھنے سے قاصر تھے، اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایک کل وقتی ادیب کے طور پر گزارا۔ بہت کم مدّت میں انھوں نے تین سو سے زیادہ کہانیاں، ناول، ڈرامے، مضامین لکھے۔ ترجمے کیے۔ ادارتی ذمے داریاں نبھائیں۔ سماجی اور معاشرتی خدمت کا کام کیا۔ ایک بے آرام اور حساس ذہن کی یہ کارکردگی حیران کن ہے۔ پریم چند کے بعض ناولوں کی ضخامت اور ان کی دوسری تخلیقات اور تحریروں کے حجم کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو خیال آتا ہے کہ پریم چند نے جس غیر معمولی رفتار کے ساتھ لکھا، اس کا بوجھ عام لکھنے والے نہیں اُٹھا سکتے۔ اپنی بعض تخلیقات میں پریم چند کا شعور معیار کی جس سطح تک پہنچتا ہے، اس تک رسائی بھی بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ پریم چند نے ایک ادیب اور مصنف کے علاوہ ایک ذمہ دار شہری اور ایک عام انسان کے فرائض بھی ادا کیے۔ یہ انسان اپنے زمانے کے سب سے حساس، باشعور اور شریف النفس انسانوں میں شامل تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسے اپنے دور کے تخلیقی معاشرے میں بھی ایک سربراہانہ حیثیت حاصل تھی۔ اس طرح، پریم چند کی ایک ساتھ کئی حیثیتیں تھیں اور اپنی ہر حیثیت میں وہ منفرد اور ممتاز تھے۔

غیر معمولی کہانیوں کا تناسب پریم چند کے مجموعی سرمائے میں، بے شک، بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن پریم چند کی منتخب تحریریں، فکشن میں عالمی پیمانے پر منتخب تحریروں کے ساتھ رکھی جاسکتی ہیں۔ پریم چند عالمی ادب کے مشاہیر کی انجمن میں اجنبی نہیں دکھائی دیتے۔

لہٰذا یہ پندرہ افسانے بھی جو اس انتخاب میں شامل ہیں، فکشن کی قومی اور بین الاقوامی روایات کے بعض بنیادی اور بہترین اوصاف کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ 'بڑے گھر کی بیٹی' سے 'کفن' تک کا تخلیقی سفر، پریم چند کی ذہنی مسافت کے ساتھ ساتھ، ان کی بوجھل اور بے قرار روح کے سفر کی روداد سے بھی پردہ اُٹھاتا ہے۔ یہ روداد ۱۹۱۰ء سے شروع ہوئی ہے جو 'بڑے گھر کی بیٹی' کا سالِ تحریر ہے۔ اور یہ روداد ختم ہوتی ہے ان کے افسانے 'کفن' پر جو ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا۔ ۱۹۳۶ء پریم چند کی زندگی کا آخری سال تھا۔

یہاں 'بڑے گھر کی بیٹی' کے ایک اور امتیاز کی نشاندہی بھی غالباً نامناسب نہ ہوگی۔ یہ پہلی کہانی ہے جو پریم چند کے قلمی نام کے ساتھ شایع ہوئی۔ (۱۹۱۰ء) اس طرح یہ نام پریم چند کی شخصیت کا شناس نامہ بنا اور پھر آگے کے چھبیس برسوں تک جب تک کہ پریم چند کے قدم ہماری زمین پر جمے رہے، یہی نام ان کی پہچان قرار دیا گیا۔ پریم چند نے زندگی جن قدروں کی تفسیر اور تخلیقی تعبیر کے لیے وقف کی، ''بڑے گھر کی بیٹی'' ان قدروں کا پہلا موثر، پرکشش اور پائدار نقش ہے۔ پریم چند کے نزدیک گھر سماجی زندگی کی سب سے مضبوط اکائی ہے اور اس اکائی کا مرکزی حوالہ عورت کی ذات ہے۔ عورت ہی گھر کو منظم رکھتی ہے اور اسے بکھرنے سے بچاتی ہے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں میں انسان اور انسان کے تعلق کو ہمیشہ اپنی حسیت کے ایک اہم حوالے، اجتماعی زندگی سے وابستہ ایک اہم موضوع کے طور پر دیکھا۔ یہ کہانی بھی اپنے مخصوص انداز میں انسانی رشتوں کی گرہ کھولتی ہے اور انسانی وجود کے مقصد کی وضاحت کا ایک فنکارانہ ذریعہ بنتی ہے۔

''نمک کا داروغہ'' میں پریم چند نے سماجی زندگی کی ایک تباہ کن لعنت رشوت خوری اور لالچ سے پردہ اُٹھایا ہے۔ پریم چند کے زمانے میں، ہمارا معاشرہ آج کے جیسا صارفی نہیں ہوا تھا اور وہ شخصی روّیے جو صارفیت کے میلان کی وجہ سے نمودار ہوئے، اس وقت تک آج کی طرح کھل کر سامنے نہیں آئے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ انسانی معاشرے اور اجتماعی زندگی کے بیرونی خدوخال تو بے شک بدلتے رہتے ہیں، تاہم، کچھ خصائص اور سچائیاں ایسی بھی ہیں جو انسان کی ہستی سے جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہیں اور جن کا اثر ہر عہد کے انسان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا، اپنی حیثیت اور وسائل پر قانع نہ ہونا، چھوٹی چھوٹی راحتوں کے لیے بڑی قدر کو قربان کر دینا، یہ باتیں اپنی کوئی معینہ تاریخ نہیں رکھتیں اور ان کا تعلق انسان کی بنیادی سرشت سے ہے۔ پریم چند نے معلم اخلاق اور واعظ کا مصنوعی لبادہ اوڑھے بغیر، اس سماجی مرض کی ہلاکتوں سے ہمیں آگاہ کرنا چاہا ہے اور اپنے تخلیقی مقاصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ یہاں نمک کو مادّی زندگی کے ایک دائمی استعارے کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

''نمک کا داروغہ'' کو اگر اپنا طبیعی پس منظر شہری زندگی کے واسطے سے ملا ہے، تو اس مجموعے کے تیسرے افسانے 'پنچایت' کا پس منظر دیہاتی زندگی ہے۔ پریم چند اپنے اجتماعی ماضی سے وابستہ رسموں اور روایتوں کا احاطہ اس لیے نہیں کرتے کہ انھیں ماضی سے کوئی خاص لگاؤ تھا۔ وہ دراصل انسانی زندگی کے مختلف مظاہر کو ایک سلسلے کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے اور ان کا دھیان اس سچائی پر ہمیشہ مرکوز رہتا تھا کہ انسانی زندگی کے نقشے یا سماجی صورت حال کے بدل جانے سے انسان کے وجود میں پیوست خصلتیں نہیں بدلتیں۔ ''پنچایت'' کی کہانی بھی اسی رمز سے ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ انسانی قدریں اور انسانی رشتوں کا احساس، سب کچھ مادّی اور طبعی تقاضوں کا پابند ہے۔ یہ تقاضے انسان پر جب غالب آتے ہیں تو وہ بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اپنی قدروں اور رشتوں کے احساس سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے۔ یہی آزادی اسے دنیوی مصلحتوں اور اغراض کا غلام بناتی ہے۔

پریم چند کی بصیرت انتہائی گمبھیر اور سنجیدہ ماحول میں بھی شوخی اور مزاح کے سرے ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یوں مزاح المومنین کی حد سے وہ کبھی آگے نہیں بڑھتے اور نہ تو خود قہقہہ لگاتے ہیں نہ اپنے قاری کو کھل کر ہنسنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کی شائستہ ظرافت، خوش طبعی کے اظہار کی صورتیں بہت بے ساختہ طریقے سے پیدا کر لیتی ہے۔ اس لحاظ سے ''نمک کا داروغہ'' اور ''پنچایت'' دونوں بہت دل چسپ افسانے ہیں۔

''شطرنج کی بازی'' کو شہرت اپنے تاریخی حوالے کے علاوہ کچھ اس لیے بھی ملی کہ ستیہ جیت رے جیسے عہد آفریں فلم ساز نے اس کہانی پر فلم بنائی۔ لیکن یہ کہانی تاریخ کے ایک معلوم حوالے اور پس منظر میں پیوست ہونے کے باوجود اپنے آپ کو Dehistorisize بھی کرتی ہے، یا تاریخ کے حصار سے خود کو باہر بھی لے آتی ہے۔ اودھ کی حکومت کا زوال دراصل ایک انحطاط پسند انسانی روّیے اور ہمارے فیوڈل معاشرے کے ضمیر میں شامل ان عناصر کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے جو جنوبی ایشیا، بالخصوص اس برصغیر کی پسماندگی کا بنیادی سبب کہے جا سکتے ہیں۔ پریم چند نے اس کہانی میں ملال آمیز طنز کا پیرایہ اختیار کیا ہے اور مزاح کو سنجیدگی کی شکل دے کر ایک انوکھی فضا خلق کی ہے۔ یہاں پریم چند کی حسیت پر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا اثر بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی تمام تر تخلیقی متانت کے باوجود پریم چند سرشار کے احاطۂ اثر سے کبھی بھی پوری طرح نکل نہیں سکے۔ ''فسانۂ آزاد'' جسے پریم چند نے آزاد کتھا کی شکل دی، ان کے لیے ایک رول ماڈل بھی تھا۔ انھوں نے ''شطرنج کی بازی'' کے علاوہ بھی بعض دوسری کہانیوں میں اپنے کرداروں کو جس طرح برتا ہے یا کہانی کے لیے جو لسانی سانچا وضع کیا ہے اور اظہار کے جس

اسلوب سے مدد لی ہے، ان سب پر سرشار کا سایہ بہت گہرا ہے۔ زوال کے جس تماشے کی عکاسی ''شطرنج کی بازی'' میں کی گئی ہے، اس سے پریم چند کی طبیعت میں شامل انسانی سوز اور دردمندی کے پہلو بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ اس افسانے کا سب سے اہم وصف اس سے جھلکنے والی تخلیقی معروضیت ہے۔ پریم چند کے انداز میں نہ تو کسی طرح کی تضحیک پیدا ہوئی ہے، نہ سنگینی، نہ تو لطف اندوزی کا اظہار ہوا ہے نہ کسی طرح کی نوحہ گری کا۔ پریم چند مشکل مقامات سے بھی اس کہانی میں آسانی گزر گئے ہیں، خاص کر اس موقع پر جہاں بازی مرزا صاحب کے گھر سے میر صاحب کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

''سوا سیر گیہوں'' پریم چند کے ان معروف افسانوں میں ہے جو ان کی حسیت کے حقیقت پسندانہ عناصر کے ایک نقطۂ عروج سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں۔ زمانی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ افسانہ پریم چند کے شاہ کار افسانے 'کفن' سے تقریباً بارہ برس پہلے لکھا گیا تھا۔ ''شطرنج کی بازی'' میں پریم چند نے مسلم اشرافیہ کی زندگی کے ایک المیہ بعد کی عکاسی کی تھی۔ ''سوا سیر گیہوں'' کا طبقاتی حوالہ یکسر مختلف بلکہ ''شطرنج کی بازی'' کے ایک متضاد مظہر کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ شہر کے برعکس گاؤں کی فضا، تربیت یافتہ اور تعیش کی زندگی گزارنے والے کرداروں کے برعکس نہایت مشکل اور صبر آزما حالات میں سانس لینے والے ان گھڑ دیہاتی، یا تصنع اور تکلف سے معمور مکانی لینڈ اسکیپ کی جگہ ایک کھرا، کھردرا، درشت اور دہشت سے بھرا منظر یہ۔ پریم چند نے اس افسانے میں ایک طرح کی برہنہ حقیقت نگاری کے وسائل کو جس وضع احتیاط کے ساتھ سنبھل سنبھل کر برتا ہے، اس سے ان کی غیر معمولی فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ پریم چند کے طبقاتی شعور اور ان کی عام معاشرتی اور سماجی بصیرت کے مطالعے میں بھی اس قبیل کے افسانوں کی ایک خاص حیثیت ہے۔

''مندر اور مسجد'' اپنے موضوع، مصنف کے موقف اور پلاٹ کی تشکیل میں مصنف کے مجموعی برتاؤ کے لحاظ سے بہت حساس کہانی ہے۔ مشرقی اتر پردیش ہی کے علاقے (ایودھیا) میں ۱۹۹۲ء میں ۶ ردسمبر کو بابری مسجد کے انہدام کا وہ سانحہ بھی ہوا جس نے ہماری اجتماعی یادداشت میں مسجد اور مندر کے لفظوں کو ایک نئے مفہوم سے ہم کنار کیا ہے اور ان لفظوں کے مناسبات اس طرح تبدیل کیے ہیں کہ اب ان سے ایک سیاسی جہت بھی وابستہ ہوگئی ہے۔ بہ ظاہر تو یہ ایک سیدھے سچے دیندار مسلمان کی کہانی ہے جو اپنے عمل سے سچی مذہبیت کو نہ صرف یہ کہ ایک وسیع تناظر عطا کرتا ہے، پریم چند کی فکر میں شامل مذہبی عناصر کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے۔ پریم چند آریہ سماج سے متاثر تھے اور مزاج کے اعتبار سے اصلاح پسند تھے۔ ان کی زندگی کا یہ مثالی واقعہ یاد کیجیے کہ ایک دن انھوں نے لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی (۱۹۳۶ء) اور اس

کے اگلے ہی دن لکھنؤ سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئے جہاں انھیں آریہ سماج کے ایک کنونشن میں شریک ہونا تھا۔ اس سے پریم چند کی نفسیاتی ترکیب کا بھی کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پریم چند کے لیے زندگی کی طرف ایک صحت مند اخلاقی روّیے، ایک گہری انسان دوستی، اور سچی دینداری یا مذہبیت کم و بیش ہم معنی الفاظ تھے۔ پریم چند کے بعض نقاد جوان کی جذباتی اور مذہبی ترجیحات کا ایک غلط اور تعصب آمیز تصور رکھتے ہیں، انھیں یہ کہانی خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھنی چاہیے۔ اس کہانی میں پریم چند کا نقطۂ نظر مذہب اور مذہبیت کے بارے میں بہت واضح ہے۔ اس میں ذرا بھی ابہام نہیں ہے۔ یہاں پریم چند مذہبی میلان میں جذباتیت کے عمل دخل سے پیدا ہونے والے خطروں سے بھی ہمیں خبر دار کرتے ہیں اور ''وفاداری بہ شرطِ استواری'' کے تصور کو ایک حقیقت پسندانہ سیاق میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ افسانے کے انجام پر مثالیت کا گمان فطری ہے، لیکن ہمیں بہرحال اس واقعے کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کہ پریم چند کی حقیقت پسندی کا خاکہ ان کے آدرش واد اور ان کی مثالیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کہانی کی روشنی میں یہ واقعہ بھی بہت معنی خیز ہے کہ اس کی اشاعت پہلے ہندی خواں طبقات میں عام ہوئی۔

رومانی انقلاب پسندی کا رنگ ''جلوس'' میں اور زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ یہ کہانی پریم چند نے اس دور میں لکھی (۱۹۳۰ء) جب گاندھی جی کے اثر سے ہماری اجتماعی زندگی میں قومی آزادی کی تحریک نے ایک نئی ہیئت اختیار کر لی تھی۔ یہ ہیئت تھی ''ستیہ گرہ'' یا پرامن جدو جہد کی جس نے طاقت اور اقتدار جیسے لفظوں کے معنی بدل دیے۔ عدم تشدد کا فلسفہ جس نے بیسویں صدی کے دوران دنیا کے بہت سے ملکوں اور قوموں کو آزادی کی جدو جہد اور تحریک کا ایک نیا راستہ دکھایا، پریم چند کی اس کہانی کے مرکزی خیال کی بنیاد ہے۔ ''مندر اور مسجد'' کی طرح اس کہانی میں بھی وہ کردار، جس کے گرد سارا واقعہ گردش کرتا ہے، ایک مسلمان کا کردار ہے اور پریم چند نے اسے فرقے یا مسلک کے بجائے اس کے فکری زاویے یا اس کے اخلاقی موقف کی روشنی میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے برطانوی سامراج کے دوران قومی آزادی کی تحریک کے مزاج اور تحریک کے اُس خارجی اسٹرکچر پر بھی روشنی پڑتی ہے جس میں ہندو مسلمان کا فرق یکسر مٹ گیا تھا اور علاحدگی پسندی کی سیاست کے لیے جس میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ پریم چند نے بہت موثر پیرائے میں آزادی کی تحریک کے سیکولر کردار کی نشان دہی کی ہے۔ وطن دوستی کا جذبہ جو پریم چند کی پہلی معروف کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کی پہچان اور محرک کہا جا سکتا ہے۔ ''جلوس'' کی تہہ میں بھی کارفرما ہے اور اپنے بیانیے کی رفتار اور نوعیت کے واسطے سے ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ والے واقعے کی یاد دلاتا ہے۔ اس کہانی کا تانا بانا کچھ یوں تیار کیا گیا ہے کہ اس

میں پریم چند اصطلاحاً Feminist نہ ہوتے ہوئے بھی، اپنے عہد کی عام روش کے برعکس، ہر طرح کے صنفی تعصب (gender bias) سے آزاد نظر آتے ہیں۔

''پوس کی رات'' واقعے سے زیادہ صورت حال اور فضابندی کے عمل پر مبنی افسانہ ہے۔ یہ کہانی ہمیں منٹو کے افسانے ''ہتک'' کی یاد دلاتی ہے اور ''پوس کی رات'' کا دکھی اور دردگزیدہ کردار ہلکو منٹو کی سوگندھی کی طرح اپنے ایک خود اختیارانہ عمل سے اپنی ذات پر حاوی، زمانے کے جبر کی عکاسی کرتا ہے۔ کم سے کم کرداروں کی مدد سے اور واقعات کا طومار باندھے بغیر، پریم چند نے اس کہانی میں جس ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ ایک الم آمیز انسانی صورت حال کا احاطہ کیا ہے، اردو افسانے کی تاریخ میں ''پوس کی رات'' سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ 'کفن' میں پریم چند اپنے فن کی جس بلندی تک پہنچے ہیں اس کی پہلی آہٹ ہمیں ''پوس کی رات'' میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایک انتہائی طاقت ور کہانی ہے۔ مرکزی کردار کے گرد پھیلے ہوئے مظاہر اور اس کے باطنی منظرنامے میں پریم چند نے ایک فنی ہم آہنگی کے نشانات دریافت کیے ہیں۔ اس طرح ان کے مشاہدے، بصیرت اور انسانی روح کے عمیق ترین گوشوں تک جا پہنچنے کی صلاحیت کا بہت مستحکم اظہار ''پوس کی رات'' میں ہوا ہے۔

اسی طرح 'نجات' بھی ایک قوی الاثر افسانہ ہے اور پریم چند کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی اس کی جگہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ وہی دہشت خیز حسن (terrible beauty) جو ''پوس کی رات'' اور ''کفن'' میں پایا جاتا ہے، ''نجات'' کا حصہ بھی ہے۔ یہ کہانی ادب اور آرٹ کی اس جمالیات اور باطنی فضا کی عکاس ہے، جس کی پہچان اکثر اسپین کی خانہ جنگی کے موضوع پر ''پکاسو'' کے لازوال شاہ کار ''گوئرنکا'' کی مدد سے کی جاتی ہے، انسانی زوال، بہیمیت، درندگی اور جذباتی تشدد کی بے مثال تصویر۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پریم چند کے اسلوب میں یہاں بھی وہی نرم روی ، دھیماپن اور ضبط دکھائی دیتا ہے جو ان کی حساس لیکن انتہائی منظم اور توانا تخلیقی شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ تھا۔ اس طرح کی بے رحم حقیقت نگاری اور ایک پُرفریب سنگینی اس سے پہلے اردو فکشن میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس ہیبت ناک افسانے کا اختتام یوں ہوا ہے کہ:

> ''رات تو کسی طرح کٹی۔ مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی۔
>
> پنڈت جی نے ایک رسّی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے

رسّی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں کے باہر لے گئے۔
وہاں سے آکر فوراً نہائے۔ درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔۔۔۔ ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھکتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔''

ایسی اشتعال آمیز دردمندی، اتنا مہیب اور کڑوا سچ، بیانیے میں اس درجے کی سنگین لاتعلقی، اردو فکشن کے پورے سرمائے سے قطع نظر، خود پریم چند کی کہانیوں میں بھی خال خال ہی نمودار ہوئی ہے۔

چھوا چھوت اور پسماندہ طبقوں یا ہریجنوں کی بدحالی کے موضوع پر پریم چند نے متعدد کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس مسئلے کے باعث رہ رہ کر ان کے دل میں ٹیس اٹھتی تھی اور ہماری اجتماعی زندگی کا یہ عذاب ہمیشہ ان کے احساسات کا تعاقب کرتا رہتا تھا۔ ''ٹھاکر کا کنواں'' بہت چھوٹی سی کہانی ہے اور اس میں کسی طرح کا پیچ نہیں ہے۔ ہماری آبادی کے ایک خاصے بڑے حصے کو آج بھی پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ اسی واقعے نے اس کہانی کو بنیاد فراہم کی ہے۔ پریم چند نے سماجی تفریق کی صدیوں پرانی لعنت کا عذاب جھیلتی ہوئی، پامال اور واماندہ روحوں کی مقدر پرستی کی طرف بھی اس کہانی میں بالواسطہ اشارے کیے ہیں۔ ایک معمولی عورت کے ایثار اور بیمار شوہر کے لیے اس کے مامتا جیسے جذبے کی عکاسی بھی پریم چند نے اس کہانی میں ایک چھوٹے سے واقعے کی مدد سے کی ہے۔ اعلا طبقوں کے کردار کی پستی اور نچلی سطح کی زندگی گزارنے والوں کے کردار کی بلندی کا تاثر بھی اس کہانی کے ذریعے اپنے آپ قائم ہوتا جاتا ہے۔ کہانی کا انجام مبالغہ آمیز، غیر فطری یا غیر متوقع نہیں، پھر بھی ہمارے اعصاب اور حواس پر اس کا اثر بہت شدید ہوتا ہے اور ہم اندر ہی اندر کانپ کر رہ جاتے ہیں۔ میلے گندے پانی کا لوٹا منہ سے لگائے ہوئے، بیمار جوکھو، ایسا لگتا ہے کہ ہماری سنسکرتی کو سجانے والے تمام آدرشوں کی ہنسی اڑا رہا ہے اور یہ بتا رہا ہے کہ وقت چاہے جتنا بدل جائے، تاریخ کے عذاب اتنی آسانی سے ختم ہونے کے نہیں ہیں۔ تو کیا ہمیں تاریخ کے ہر تشدد کو چپ چاپ قبول کر لینا چاہیے؟ پریم چند نے یہ سوال ہم سب کے سوچنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

اپنی عنصری سادگی کی وجہ سے، یوں تو پریم چند کی ہر کہانی اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہے اور اردو فکشن کے وسیع ذخیرے میں دور سے بھی پہچانی جا سکتی ہے، لیکن کچھ کہانیوں میں تو پریم چند کی فنکاری اور ان کی حسیت اپنے نقطۂ کمال تک جا پہنچی ہے۔ انہی منتخب افسانوں میں ''عیدگاہ'' بھی شامل ہے۔ افلاس اور عملی زندگی کی سختیاں ایک ننھی سی جان کو بھی کس حد تک اور کتنی جلدی،

غیر معمولی طور پر حقیقت پسند بنا دیتی ہیں، اس کی بہت جاندار مثال ایک بچے حامد کی شخصیت ہے جو یتیم ہے اور جس کی پرورش کا بوجھ اس کی بوڑھی دادی امینہ پر ہے۔ حامد بچہ ہے لیکن اُس کے بچپن پر بلوغ کی عمر کا سایہ وقت سے پہلے پھیل جاتا ہے اور عید کے دن اپنی مختصر سی عیدی سے وہ کوئی کھلونا خریدنے کے بجائے بوڑھی دادی کے لیے ایک دست پناہ خرید لیتا ہے تاکہ روٹیاں سینکتے وقت دادی کے ہاتھ نہ جلیں۔ کسی نے کہا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی کہانیاں وہ ہیں جو سب سے زیادہ سادہ اور بے ساختہ پیرائے میں بیان کی گئی ہوں۔ ''عید گاہ'' کا سب سے بڑا وصف بھی یہی ہے۔ اس افسانے کا ''حسن'' اس کی وحشت زدگی اور ہمارے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے کی طاقت میں ہے۔ پریم چند نے سامنے کی تفصیلات بیان کی ہیں کہ کس طرح دوسرے بچوں کے ساتھ حامد بھی عید کی نماز میں شامل ہوتا ہے اور واپسی میں کھلونوں کی دوکانیں دیکھتا ہے۔ اس پس منظر میں سب سے بڑا اور ہولناک کھلونا تو خود حامد کی اپنی ذات ہے جسے مشیت نے اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا ہے۔ اپنی ملال آمیز خوب صورتی کے باعث یہ کہانی پریم چند کے اچھے افسانوں میں بھی ایک علاحدہ شان رکھتی ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں 'نشہ' پر نگاہ اس لیے ٹھہرتی ہے کہ اس سے ایک تو ان کی نفسیاتی باریک بینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، دوسرے ان کے شعور کی وسعت اور اخلاقی مساوات سے ان کے مزاج کی مناسبت کا بھی اظہار ہوا ہے۔ کہانی کا موضوع بلکہ مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ڈی کلاس (Declass) کرنے کی کوشش میں کبھی کبھی مضحک ہوجاتا ہے۔ ہنس کی چال چلنے کے پھیر میں کوا اپنی چال کس طرح بھلا بیٹھتا ہے، اس حقیقت کی بہت دل چسپ تفسیر ''نشہ'' میں ملتی ہے۔

یہاں پریم چند نے یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ مظلوم ایک بار اقتدار کے نزدیک پہنچ جائے تو اس کے دل میں بھی ظالم کے طور طریقے اختیار کرنے کی ہوک اُٹھتی ہے۔ لیکن ہم اپنے سائے سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے، اس لیے، جب بھی جھوٹی زندگی گزارنے کی کوشش کریں گے، اپنا آپ بھی گنوا بیٹھیں گے۔ غالب نے کہا تھا۔۔۔ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو۔ یہ ایک سچی وجودی طلب ہے، لیکن اس کہانی میں جب ایک غریب طالب علم عارضی طور پر اپنے ایک خوش حال دوست کا مہمان ہوتا ہے اور جسمانی راحتوں کے ایک لذت بخش تجربے سے گزرتا ہے تو اپنے ماضی کو، اپنی ہستی کی بنیادوں کو یکسر بھلا بیٹھتا ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب سچویشن ہے جو اس دل چسپ بیانیے میں ایک غم آلود طربیے کا رنگ پیدا کردیتی ہے۔ جھوٹی اور مصنوعی زندگی گزارنے والا خود اپنی نظروں میں کتنا خوار ہوتا ہے، اس قسم کا اخلاقی موقف اپنائے بغیر پریم چند نے بہت موثر طریقے

سے اپنی بات اس کہانی کے قاری تک پہنچادی ہے، بہ ظاہر ایک شگفتہ کہانی، لیکن پڑھنے والے کو بالآخر ملال اور دل گرفتگی کے ایک گہرے تجربے سے دوچار کرنے والی۔ پریم چند کے ادراک و اظہار میں جو رنگارنگی اور ان کے شعور سے وابستہ جہتوں میں جو غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے، اس کی کچھ نمائندگی اس کہانی سے بھی ہوئی ہے۔

اسی رنگارنگی کی ایک اور نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ ''دودھ کی قیمت'' ہے۔ پریم چند نے زیادہ لمبی عمر نہیں پائی، لیکن ان کا تخلیقی شعور ہمیشہ سرگرم رہا اور وہ بے تکان لکھتے رہے۔ خاص کر، زندگی کے آخری چند برسوں میں تو ان کی جتنی تحریریں سامنے آئیں ان سے ان کی تخیلی زرخیزی، بصیرت کی کشادگی اور بیان کی پختہ کاری کا ایک نیا معیار مرتب ہوتا ہے۔ ''دودھ کی قیمت'' نامی افسانے کی وساطت سے پریم چند نے اس اندوہ ناک واقعے کی نقاب کشائی کی ہے کہ حاجت مندی اور غربت زندگی کی ہر قدر کو مادّی نفع ونقصان کے حساب سے دیکھتی ہے۔ ہر مجبوری خریدی جاسکتی ہے چناں چہ گاؤں کے زمیندار کے بیٹے کو نچلے طبقے کی ایک نادار عورت جب تک اپنا دودھ پلاتی رہتی ہے اس کا اپنا مرتبہ اور وقار بھی بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس خدمت کے نتیجے میں وہ خود اپنے بچے کو بھوکا رکھتی ہے۔ کچھ دنوں بعد اس عورت کا شوہر مرتا ہے، پھر خود وہ مر جاتی ہے اور اس کا یتیم بچہ زمیندار کے گھر میں روکھے سوکھے ٹکڑوں پر پلنے لگتا ہے۔ وہ اسی گاؤں کے ایک کتّے کے راتب میں اپنی بھوک مٹانے کا سامان بھی ڈھونڈ لیتا ہے اور اس کا وجود کسی طرح کی ذلت کے احساس سے یکسر عاری ہوتا جاتا ہے۔ مقدر پرستی کے رویّے سے یہاں جس بات نے پریم چند کو بچائے رکھا، یہ ہے کہ زمین دار کے بیٹے کی غذا میں شریک ہونے سے لے کر، کتّے کے راتب میں سے حصہ بٹانے کے تجربے تک، منگل نے حقیقت کی جس سطح پر سفر کیا ہے، وہ ایک کھردری، کھولتی ہوئی سطح ہے، اور اس کی آنچ اور اذیت اس کہانی کے قاری کے دل ودماغ تک بھی پہنچ ہی جاتی ہے۔

افسانہ ''بڑے بھائی صاحب'' پریم چند کی انسان فہمی اور کردار نگاری کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ اس کہانی میں بھی مزاح اور سنجیدگی کی حدیں گڈمڈ ہوگئی ہیں۔ پریم چند نے جس فطری بہاؤ کے ساتھ ظرافت اور متانت کے رنگ باہم ملائے ہیں اور ملال میں خوش طبعی کے عنصر کی دریافت کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی وجود کی حقیقت کو سمجھنے اور کہانی میں اسے پیش کرنے کا جتنا سلیقہ پریم چند کو حاصل تھا، اس تک ان کا کوئی ہم عصر نہیں پہنچ سکا۔ ''سگ باش برادر خورد مباش'' کی عام کہاوت اور خاندانی ماحول میں انسانی رشتوں کے مفہوم کو پریم چند کے شعور نے جس طرح اپنی گرفت میں لیا ہے اور بادی النظر میں بہت ہلکے پھلکے طریقے سے گہری باتیں کہنے کا جو راستہ نکالا ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پریم چند ایک نیچرل فکشن لکھنے والے تھے۔ ہر احساس، ہر

خیال، ہر قدر، ہر ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی تجربہ ان کے ذرا سے اشارے پر کہانی کا قالب اوڑھ لیتا تھا۔ اس کہانی میں انھوں نے بڑے بھائی کے کردار کو اپنی برتری اور بزرگی کا بھرم بنائے رکھنے کے لیے جس قسم کی باتیں کرتے ہوئے دکھایا ہے وہ بہت دل چسپ ہیں۔ لیکن یہ بھرم بالآخر ٹوٹ جاتا ہے اور شخصیت کے فطری اظہار کا دباؤ انھیں اور چھوٹے بھائی کو ایک صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ کہانی نفسیاتی دروں بینی اور باطنی حقیقت نگاری کی ایک دل چسپ مثال ہے۔

زیر نظر انتخاب کا آخری افسانہ 'کفن' ہے اور پریم چند کی زندگی کے اس دور کی یادگار ہے جب وہ اپنا سفر تقریباً پورا کر چکے تھے اور ان کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ لیکن اس افسانے میں تناؤ کی جو فضا، جذباتی تشدد کا جو ماحول، احساس کی جو شدت اور اظہار میں جو غیر معمولی ارتکاز ملتا ہے، اس نے اس افسانے کو اردو ہی نہیں عالمی فکشن کے شہ پاروں میں شمولیت کی طاقت بخش دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تخلیق کی جو آگ پریم چند کے سینے میں تاعمر روشن رہی، 'کفن' اس کا نقطۂ عروج ہے۔ پریم چند یہاں اپنے آپ کو بھی عبور کر گئے ہیں اور ایک ایسی سطح کمال تک اس افسانے کو انھوں نے پہنچا دیا ہے جہاں وہ بھی اپنی گنتی کی دو چار کہانیوں میں ہی پہنچ سکے تھے۔ گھیسو اور مادھو کے کردار اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ہمارے اعصاب کو جھنجھوڑنے کی طاقت رکھتے ہیں اور دھرم، سنسکار، روایت، سنسکرتی، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور طبقاتی تضادات، انسان کی بے حسی اور جھوٹے آدرشوں کے کھوکھلے پن کی بابت، بالواسطہ طریقے سے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں، جسے پریم چند کی معاشرتی فکر اور اجتماعی شعور کے جوہر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہانی اتنی اثر انگیز ہے کہ لفظوں سے آگ کی لپٹیں سی نکلتی محسوس ہوتی ہیں۔ پریم چند کے اجتماعی شعور کے ساتھ ساتھ یہ کہانی ان کی انفرادی بصیرت اور افسانے کے فن پر ان کی ماہرانہ گرفت، اور زبان و بیان پر ان کی قدرت کا آئینہ بھی ہے۔ الفاظ اور حروف، علائم اور اشیا جن کی مدد سے اس کہانی کا لسانی ملبوس تیار کیا گیا ہے، کرداروں کی طرح جاندار اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کہانی زمان و مکان کے جبر اور اس جبر سے آزادی، دونوں کی ترجمان کہی جا سکتی ہے۔ یہ افسانہ مختصر ہوتے ہوئے بھی بہت طویل ہے، اپنی معنویت کے لحاظ سے، اور اس حقیقت کا مظہر بھی ہے کہ ایک چھوٹی سی کہانی میں تجربے اور اظہار کے کتنے وسیع امکانات سموئے جا سکتے ہیں۔ افسانے کے مزاج اور ہیئت میں وقت کے ساتھ چاہے جتنے تغیرات رونما ہوتے جائیں، اس کہانی کی عظمت کبھی ماند نہ ہوگی۔

پس نوشت:

اخیر میں چند وضاحتیں ضروری ہیں:

۱- افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے سب سے بڑے فکشن نگار کے تخلیقی متن کی تدوین کا کام، ابھی تک جیسا کچھ سامنے آیا ہے، اسے تشفی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ مختلف کتابوں میں ایک ہی متن کی الگ الگ شکلیں ملتی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا اتنا بڑا کام اپنے ذمے لیا تو اس کام کی سطح اور اس کی تدوین و ترتیب کے تقاضوں پر بھی مناسب توجہ دی جانی چاہیے تھی۔ ایسا بوجوہ ممکن نہ ہو سکا۔ کونسل کی شائع کردہ کتابوں میں غلطیاں بہت ہیں۔ تدوین کے ساتھ ساتھ متن کی کمپوزنگ بھی ناقص ہے۔ تاہم، مجبوراً ہم نے اسی سلسلے کو سامنے رکھا ہے۔

۲- اس انتخاب میں جو پندرہ افسانے شامل ہیں، ان سے پریم چند کے موضوعات کی رنگارنگی، ان کے سروکاروں (Concerns) کی وسعت اور سچائی، ان کے سماجی کمٹ منٹ اور ان کے تاریخی شعور پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر انتخاب کی طرح یہ انتخاب بھی ناکافی ہے۔

۳- اس انتخاب میں شامل تخلیقات کے توسط سے پریم چند کے اسلوب اور زبان و بیان کے مختلف شیڈس کو بھی یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴- 'روح عصر کی ترجمانی' ایک مبہم اور ڈھیلی ڈھالی اصطلاح ہے۔ لیکن، بہر حال، یہی اصطلاح مصنف کی بصیرت اور اپنے زمانے کی طرف اس کے رویے، اسی کے ساتھ ساتھ جیتی جاگتی حقیقتوں کے حصار سے نکل کر ان تمام سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کا احاطہ بھی کرتی ہے، جو ابھی ایک نقشِ ناتمام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مستقبلیت کے عنصر پر گرفت کے بغیر کوئی تحریر بامعنی نہیں بنتی۔ ماضی کا شعور میں اس حد تک پیوست ہو جانا کہ ہم حال اور مستقبل کی طرف سے یکسر بے نیاز ہو جائیں، بڑے اور بامعنی فکشن کے مطالبات سے بے خبری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پریم چند کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ماضی کے حدود کو سمجھتے تھے۔ اسی لیے اپنی تخلیقیت اور بصیرت کا تعلق، کسی نہ کسی طرح اپنے اجتماعی حال اور اپنے مستقبل سے بھی ملانا چاہتے تھے۔

اس انتخاب میں، پریم چند کے فکشن کی اس جہت کو، خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۵۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ انتخاب ان لوگوں کے لیے ہے، خاص کر اُن طالب علموں کے لیے جن کی رسائی پریم چند کے پورے سرمائے تک نہیں اور جو پریم چند کی چند تخلیقات کے ذریعے ان کی مجموعی فکر، اردو فکشن کی روایت پر ان کے اثرات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت کا شعور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۶۔ اس کتاب کی تیاری میں مجھے انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر، کتب خانے اور انجمن کے متعلقین سے جو مدد ملی اس کے لیے تہہ دل سے، میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

۷۔ انتخاب کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدل بسم اللہ کے مشوروں سے بھی میں نے فائدہ اُٹھایا ہے، ان کا بھی ممنون ہوں۔